

جہانگیر

مختار علی

چپ

فہرست

مفتی کا فن

سورما

پیش لفظ

1. نیلی

2. چپ

3. پُل

4. احسان علی

5. شائستہ

6. باجی

7. دوراہا

8. پریم نگر

9. تبین خدا

10. پاکل

11. دروازہ

12. گہرائیاں

13. سہارا

14. لیڈی ڈاکٹر

15. پیارا پالتو

۷

۱۵

۲۹

۳۳

۵۲

۶۹

۸۴

۱۰۳

۱۱۸

۱۳۶

۱۵۵

۱۶۵

۱۷۸

۱۹۲

۲۱۲

۲۲۷

۲۳۷

۲۵۵

فکر تو نسوی

۱۹۴۷ء

مفتی کا فن

مجھے ممتاز مفتی کے افسانوں سے زیادہ اس کی شخصیت میں بیچ و خم نظر آتے ہیں۔ پیچیدگی کی یہ لکیر گھومتے گھومتے، بھٹکتے بھٹکتے، الجھتے الجھتے ایک ایسے مدرسہ فکر کی سرحدوں سے جا ملتی ہے جسے جدید جنسی نظریاتی سکول کہا جاتا ہے۔ جنسی نظریوں سے متعمم گتھایہ فنکار — خود بھی ایک دلچسپ گتھی بن کر رہ گیا ہے۔ بسا اوقات میں سوچتا ہوں کہ اس کی یہ بل کھاتی ہوئی شخصیت اور پراسرار نظریے، دنیا کے لئے ایک عظیم ترین، خوفناک اور اٹوٹ طلسم گاہ کی تعمیر کر رہے ہیں اور جب یہ جادو کا محل اپنی تکمیل کو پہنچ جائے گا تو بھیدوں بھری روحوں کا ایک سمندر سا پھوٹ پڑے گا جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں مفتی کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہو گا اور وہ چیخ چیخ کر کہے گی — ”ہٹاؤ! میں کہاں جاؤں؟“

اس کی جسمانی ترتیب اور ذہنی ساخت میں ایک حیرت انگیز قسم کی ہم آہنگی ہے۔ یہ تخیل اور بھی استوار ہو جاتا ہے جب ہم اس کے آرٹ میں بھی اسی ہم آہنگی کو در آتا دیکھتے ہیں۔ اس مثلث میں وضاحت بھی ہے اور عدم وضاحت بھی — جب اس کا کوئی فنی نظریہ، اس کے جسم و ذہن کو بھول کر صرف ”نظریہ برائے نظریہ“ کی تفسیر بننے لگتا ہے تو مفتی گویا ساری کائنات کو بھول جاتا ہے۔ اپنے ماحول، اپنے کردار، اپنے اسلوب سے ماورا ہو کر افسانہ کی بجائے منطق کی تخلیق کرنے لگتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس مقام نازک پر ”عدم واضحیت“ ابھر آتی ہے

— لیکن جب وہ اپنے آرٹ کی حدود پر اپنے جسم و ذہن کو پہرہ دار کی حیثیت میں بٹھا رکھتا ہے تو اس کے الجھے ہوئے کردار، ماحول اور پلاٹ، باوجود آرزوئے بغاوت کے دم نہیں مار سکتے اور پھر پھڑا کر افسانہ میں زندگی اور تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسی حالتوں میں مفتی اپنے فن کی پوری شیطانی قوتوں کو کام میں لاتا ہے۔ گرد و پیش کو چوکس شکری کی طرح اپنی آنکھ میں نمایاں رکھتا ہے۔ اس ماحول سے کھیلتا ہے، زہر خند کرتا ہے اور جب تک وہ اپنے نظریے کے پورے نقوش، پھیلا پھیلا کر، انتہائی نقطوں تک نہیں لے جاتا، ماحول کے ایک ایک کونے اور کونے کے ایک ایک ذرے کو جھلکا نہیں دیتا، تب تک کھیلتا رہتا ہے، ہنستا رہتا ہے، متحرک رہتا ہے۔

جدید دور کے بیشتر فنکاروں کے آرٹ میں فرائڈ کے جنسی سکول اور مارکس کے معاشی فلسفہ کے تاثرات بیک وقت شامل ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ ان دونوں فلسفوں کا زمانی قرب ہے۔ وقت کی ستم ظریفی نے ان دونوں متضاد فلسفوں کو ایسے ماحول اور دور میں روشناس کرایا جو انقلابی کروٹیں لے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دو مختلف فکری لکیروں نے ادب میں آکر پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ نظریات گڈڈ ہو گئے اور کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ایک کا تخیل کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرے کا کہاں شروع اور ان دونوں کی باہمی آمیزش اور نظریاتی میل جول کا تعلق کیونکر برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

مفت بھی ادب کے اسی گڈڈ دور کی پیداوار ہے لیکن اس کے ذہنی اور جسمانی عناصر کے طے شدہ رجحان نے اس طوفانِ مشترک کو جلد ہی بھانپ لیا اور مفتی نے اپنے لئے فرائڈ کا انتخاب کر کے اپنا دامن صاف بچا لیا۔ وہ اشتراکیت سے مطمئن نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے سامنے انسان کے بنیادی نفسی تقاضے بار بار ابھر کر اپنے رجحاناتی تضاد کو عیاں کرتے رہتے ہیں اور مفتی سرمایہ، جائداد، طبقاتی سلج، مزدور اور قوت کار کے سبھی خارجی شعبوں کو لایعنی تک و دو سمجھنے لگتا ہے۔ نفس آدم ڈارون کے بندر سے لے کر کارل مارکس کے بندہ مزدور تک اپنی فطری خوبیوں اور

برائیوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی طبعی ارتقاء نہیں ہوا اور جب مفتی سرمایہ و محنت کی اس کھینچ تان کو دیکھتا ہے تو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی کروٹ کا لیبل تجویز کرتا ہے اور بس ایک نفسی بغاوت اور پھر ردِ بغاوت —————
— تقیل و تردید کا یہ کھیل لازمی ہے ابدی ہے۔ ”ہمیں اس جدوجہد کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔“

وہ کہتا ہے ہم کبھی کبھی اپنی بنیادوں کو ہلا کر ہنگامی لذتِ نفس حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب اس لذتیت سے اکتا جاتے ہیں تو پھر اپنے پس منظر کے خول میں آ کر دبک جاتے ہیں۔ مارکس، ہیگل، ڈارون، بدھ، عیسیٰ، ہٹلر، شالین سب اسی نفسیاتی شطرنج کے مرے ہیں۔ ان مروجہ کار قص ہمیں بھٹکا نہیں سکتا۔ ”ناچنے دو، ناچنے دو انہیں کہ یہ ناچ پھر اسی سنسان خاموشی کو مضبوط کرے گا جو ہمارے لاشعور میں لا محدود عرصے سے چلی آتی ہے۔“

میرا خیال ہے اسی نظریاتی فیصلہ نے مفتی کے آرٹ کو بچا لیا۔ اس بے ہتھم شور و شغب سے بچا لیا جس نے بہت سے فنکاروں کی ابدیت کے لئے زہر کا کام کیا ہے۔ جنس اور نفسیات کو اپنے موضوع کی سرحدیں بنا کر اس نے اپنی انفرادیت کو سنبھال لیا ہے۔ یہی دو بنیادی تقاضے اس کے ہر افسانے کے تار و پود بنتے ہیں۔ انہیں سے شت باندھ کر وہ کائنات میں بھٹکے ہوئے لاتعداد شکاروں کو اپنے دام میں پھنسا لاتا ہے۔ اس کی یہ کند شخص اور اجتماعی، دونوں بلندیوں پر پھینکی جاتی ہے اور یہی انفرادیت شاید مفتی کے آرٹ پر ابدیت کی مرہیں بھی ثبت کر دے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مفتی کے پاس صرف نظریے ہیں۔ کتابی، محسوس اور منجمد نظریے، ان میں فنکارانہ لچک نہیں ہے۔ ان میں تجربہ اور مشاہدہ کا پھیلاؤ نہیں ہے۔ وہ صرف گھٹے گھٹے، بیجان فقرات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن ان فیصلوں کے بعض حصوں سے مجھے اختلاف ہے۔ اول تو جب یہ ظاہر ہے کہ مفتی فرائڈ سکول کا طالب علم ہے تو ہم اس پر یہ الزام کیونکر دھر سکتے ہیں کہ وہ صرف کتابی فنکار

ہے۔ آرٹ زندگی کا مفسر ہے اور جس زاویے سے فرائڈ نے زندگی کی چھان بین کی ہے، ہم اس زاویہ نظر کو صرف تسلی یا غیر مرئی نہیں کہہ سکتے اور زندگی کے متعلق ان مخصوص بنیادی نظریوں کو فرائڈ، ہوا کی لہروں پر تو نہیں گونجائے گا۔ آخر اسے لفظ و بیان کو ہمارا بنانا پڑے گا اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مفتی کے نظریے صرف کتابی ہیں تو گویا ہم غیر محسوس طریقے پر اس کو ”فن برائے زندگی“ کا مفسر کہہ دیتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے لیکن کتنی سچی۔

اس کے بعد تجربہ اور مشاہدہ کی سرحد آتی ہے۔ نظریات صرف اسی وقت تک ٹھس اور منجمد رہتے ہیں جب تک انہیں چھیڑا نہیں جاتا۔ یہ چھیڑ مشاہدہ اور اس کی جزئیات کے کچوکوں سے نظریات کو زندہ اور متحرک بنا دیتی ہے۔ مفتی کے افسانوں میں اس چھیڑ کے وجود سے منکر نہیں ہوا جاسکتا۔ اس کے بیشتر افسانوں میں داخلی اور خارجی مشاہدہ کی جزئیات پھیلی پھیلی، نکھری نکھری اور ابھری ابھری دکھائی دیتی ہیں لیکن جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں، وہ کبھی کبھی نظریوں کو پھیلاتے پھیلاتے عدم واضحیت کی ”بھول بھولیاں“ کا رخ کر لیتا ہے۔ اس کی بظاہر وجہ اور بظاہر نتیجہ مشاہدے کی کمی اور کتابی انجماد کو ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس کی وجہیں مختلف ہیں ایک تو یہ کہ نظریے میں ایک کڑا پن ہوتا ہے جو افسانوی ماحول کا تحمل نہیں کر سکتا اور وہ صرف ایک فلسفیانہ اور ادق مضمون ہی میں سما سکتا ہے۔ چونکہ مفتی کے ذہن میں اپنے فن کے اظہار کے لئے افسانہ کے علاوہ فلاسفیکل مضامین کے جراثیم بھی موجود ہیں، اس لئے وہ افسانہ لکھتے لکھتے جب نظریے کی کڑی سرحدوں پر پہنچتا ہے تو اس کا قلم افسانہ کی عنان چھوڑ کر مضمون کا دامن پکڑ لیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ”متضاد مرکب“ — کا یہ زہریلا گھونٹ پی جاتا ہے آنکھیں بند کر کے — افسانہ اور مضمون سمجھ گھٹا ہو جاتے ہیں اور وہ بچارا ملزم بن جاتا ہے۔

دوسری اہم وجہ اس کے افسانہ کی عجیب سی تکنیک ہے — آج کل نفسیاتی افسانوں کا ایک بے ہنگم ہجوم دکھائی دیتا ہے جن میں انسان کی داخلی کیفیات کی تحلیل کی

جار ہی ہے۔ ایسے افسانوں کی عام تکنیک یہی ہے کہ کردار، سوچتے اور مسلسل سوچتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اندرونی گکھاؤں کے تاریک ترین رازوں کو اجالتے چلے جاتے ہیں — لیکن مفتی لاشعوری نفسیات کو اپنے انوکھے ڈھب سے دیکھتا ہے اور دیکھنے کا یہی زاویہ اس پر عائد کردہ الزام کو اور بھی استوار کر دیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی اس کی انفرادیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ نفسیاتی افسانوں کے عمومی رخ کے خوگر قاری، مفتی کی ان بوجھی شاہراہوں پر پھیلے ہوئے مبہم نقوش کو مجذوب کی بڑکھ کر اسے مطعون کر دیتے ہیں کیونکہ اگر مفتی نفسیات کے مروجہ کلیوں کی لکیروں پر اپنے افسانے کی ترتیب و تشکیل کرتا تو ہم اسے مفتی کے افسانوں کی مخصوص تکنیک نہ کہہ سکتے بلکہ صرف تقلید کا تراش لیل۔

دراصل — جب مفتی اپنے کرداروں کی لاشعوری تہوں میں پہنچ جاتا ہے تو اسے سب سے بڑی رکاوٹ یہی پیش آتی ہے کہ وہ ان گتھیوں کو کرداروں کی زبان سے براہ راست نہیں کھلوانا چاہتا کیونکہ یہ تکنیک اسے بنیادی طور پر غلط دکھائی دیتی ہے۔ اگر اس کے کردار کو یہ شعور ہو جائے کہ اس کے اندر کیا کیا مستور ہے تو گویا کردار کے وہ لاشعوری خصائص ختم ہو جاتے ہیں اور کردار میں انفرادیت باقی نہیں رہتی جو اس کی لاشعوری حالتوں میں افسانہ کی جان تھی۔

اور پھر مفتی اپنے بیان سے بھی متعینہ کرداروں کی تحلیل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ایک رجعتی تکنیک ہے۔ اس طرز اظہار میں ایک سب سے بڑا عیب یہی ہے کہ بیان کرنے والے کی خارجی اور غیر ضروری شخصیات افسانہ کی فضا پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ نظریے کی مرکزیت کو ابھارنے والے کردار پس منظر میں چلے جاتے ہیں، لاشعوری باتوں کے الجھاؤ بدستور قائم رہتے ہیں اور قاری افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی وہ مخصوص تلذذ حاصل نہیں کر پاتا جو فنکار کا مقصد ہوتا ہے۔

چنانچہ مفتی کے پیچیدہ ذہن نے اپنے لئے ایک نہایت پیچیدہ لیکن زیادہ فطری اور منفرد تکنیک کا انتخاب کیا۔ وہ کرداروں کے افعال و حرکات سے ایسی فضا کی تخلیق

کرتا ہے اور کچھ اس طرح گتھیوں کو سلجھا کر رکھ دیتا ہے کہ اس کے کردار تو بدستور اپنے اندھیروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ جو ان کے فطری مقامات ہیں۔ لیکن قاری انہیں حرکات و سکنات سے پیدا کی ہوئی فضا سے مختلف کڑیوں کو خود بخود اس آسانی سے ملا کر نظریے کی مرکزیت تک پہنچ جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ گویا مفتی اپنے قاری کے ذہن کی پگڈنڈیوں کو فنکارانہ طریق سے اس چوراہے پر لے آتا ہے جہاں وہ نظریہ نہایت وسیع، پھیلا پھیلا اور صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے اور قاری اچھل پڑتا ہے۔ ”ہیں!!“ — اور ”ہیں“ کا یہی تحریر ہی مفتی کی افسانوی تکنیک کا مقصود ہے۔

نظریے کے کڑے پن میں لچک اور تجربہ میں پھیلاؤ نہ ہونے کا باعث مفتی کی متذکرہ بالا مشکل اور ادق تکنیک ہے جو بسا اوقات قاری کو مفتی کے ساتھ نہیں چلنے دیتی اور وہ بھٹک کر مفتی پر ہی فتوے لگا دیتا ہے۔

یہاں آکر مفتی کا اسلوب بیان بحث میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلوب کے اعتبار سے ہر بڑے فنکار کی طرح مفتی بھی ایک رنگ خاص کا مالک ہے، لیکن اس نے جس نظریاتی سکول کو اپنے فن کے لئے منتخب کیا ہے، وہ سکول اور مفتی کی بیانیہ قوتوں میں ابھی ایک دوری ہے، ایک افسوسناک بُعد ہے۔ لیکن یہ بُعد اور دوری ایسی نہیں کہ اس کے فن کی جامعیت پر اثر انداز ہوتی ہو۔ کیونکہ اس کا طرز بیان، لہجے کا سبک رفتار طنز اور ہلکے پھلکے فقرات کی نرم چھین اس کے نظریے کے ابھار کے لئے منفرد مقام رکھتی ہے۔ وہ صرف اسی اسلوب سے لاشعور کے پتھرے نظریات کو پگھلا سکتا تھا۔ اس نرمی، چھین اور سبک روی ہی سے اس گرد و پیش کے نقوش اجاگر ہو سکتے تھے جو نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کے اظہار کے باعث ظہور میں آتا ہے۔ اگر وہ معاصرین سے متاثر ہو کر کوئی ایسا پیراتیہ بیان اختیار کرتا جس میں وقار یا عظمت ہوتی تو مفتی اپنے آپ کو جھٹلا دیتا۔ اس کے فکری ماحول کی پیدائش کے لئے جس اسلوب کی ضرورت تھی، وہ مفتی کے فن کے ساتھ ہی ساتھ ظہور میں آ گیا۔

تتبع تخلیق کے لئے ہم قائل ہے اور کسی بڑے کلاکار کی یہی پرکھ ہے کہ اس کے ذہنی عکس کا رنگ پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ وہ بھی فن کی روح کا ہم رنگ ہوتا ہے اور مفتی کو یہ امتیاز حاصل ہے۔

اس کی قوت بیان اور فرامذہب نظریات کی پیچیدگیوں میں جو بعد دکھائی دیتا ہے، اس کے لئے مفتی کا وہ خارجی ماحول ذمہ دار ہے، وہ ماضی — جس نے اسے انگریزی لٹریچر کا متوالا تو بنا دیا لیکن اردو کے کلاسیکل ادب سے کماحقہ روشناس نہ ہونے دیا اور جب مفتی نظری طور پر صلاحیتوں کے اس موڑ پر پہنچا جہاں اسے ”پیامبری“ کے فرائض سرانجام دینا تھے اور نظریات کو ایک فنکار کی حیثیت سے منظر عام پر لانا تھا تو زبان کی دشوار گزار گھٹائیاں اس پر بند تھیں۔ یعنی وہ ایک گونگا مفکر تھا جو صرف سوچ سکتا تھا، بیان نہیں کر سکتا تھا۔ تفکر اور اظہار کے اس دوراہے پر آکر الجھنوں کا یہ مفسر، خود ایک بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہو گیا اور وہ تھی زبان کا کاٹنا جو اس کے حلق سے اترنے ہی میں نہ آتا تھا۔ اس کا ذہن اظہار کے لئے مغربی ترتیب کا آمرالیتا تھا لیکن اردو اس ترتیب پر سرائی ناکر ہلا دیتی تھی۔ چنانچہ یہ مجبور فلسفی آج تک اس چھین کا شکار ہے اور اسی چھین کو نہ سمجھ کر اسے کبھی تو کتابی کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی مشاہدے کے میدان کا ہار ا ہوا کھلاڑی۔

وہ بعض تجربوں اور مشاہدوں سے صرف اڑتے اڑتے اشاروں کو گرفت میں لے لیتا ہے اور جب انہیں افسانوی جال میں بننے لگتا ہے تو نظریات کا کڑا پن، زبان پر نامعوری، تکنیک کا عجب اور اس کی منطقی مضمون لکھنے کی ترغیبی حس، مل جل کر اس کے افسانے کو شخص اور جامد بنا دیتی ہے۔ وہ جزئیات کی بھول بھلیوں پر داخلی لحاظ سے تو قادر ہوتا ہے لیکن خارجی اعتبار سے الفاظ اس سے بدکتے ہیں اور وہ انہیں پکڑنے کی ٹمک و دو میں تھک ہار کر اپنے معین کرداروں، افسانویت اور جزئیات کے حقائق کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور ان کے بجائے ایسے کردار تعمیر کرتا ہے جو اس کے لئے بت کا کام دے سکیں۔ خود نہ بلیں بلکہ ہلائے جائیں اور مفتی ان بتوں کو اپنے

نظریے کے شیشے سے تراش تراش کر اپنے ڈھب کا بنالیتا ہے۔ لیکن وہ ساکت و جامد بت، مشینی حرکات تو کر سکتے ہیں، فطری نہیں۔ ایسے مقالات پر پہنچ کر مفتی کے افسانوں میں خلوص اور سچائی نامکمل رہ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس معاشی جبر کا ذکر بھی لازمی ہے جو اس کی تخلیقوں پر پورے بٹھا بٹھا کر اپنے ہنگامی مقاصد پورے کر رہا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا جس مقام پر اس کی گرفت میں آئے ہوئے الفاظ اس کے نظریات کو پگھلانے کی قدرت رکھتے ہیں، وہاں اس کی جزئیات میں پھیلاؤ اور تجربہ میں بے پناہ لچکیلا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نہایت غضب ناک اور فتح مند شکاری کی طرح پے در پے ایسے نشانے لگاتا چلا جاتا ہے جو کبھی نہیں چوکتے۔ اس سب کچھ کے باوجود مجھے مفتی کے فن سے زیادہ اس کی شخصیت میں تعجب و غم دکھائی دیتے ہیں اور میرا یقین ہے کہ اگر اس کی شخصیت میں تعجب و غم نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی ایک بڑا فنکار نہ بن سکتا بلکہ صرف ایک سکول ماسٹر۔

بشیررومانی - (احمد بشیر)
۱۹۴۵ء

تعارف

سورما

ممتاز مفتی کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ آپ کسی اسکول میں چلے جائیں جہاں وہ پڑھاتا رہا ہے اور اس کے متعلق پوچھیں تو اس کے شاگرد کہیں گے ”ان کی باتیں؟ کیا بات ہے ان کی باتوں کی مگر ان کا ڈنڈا..... توبہ ہے!! اساتذہ مسکرا دیں گے..... ہاں تھا تو یار آدمی، مگر کچھ عجیب سا تھا۔“ ہیڈ ماسٹر اطمینان بھرا سانس لے گا ”خیر، اب تو یہاں سے چلا گیا، چھوڑیے اس بات کو۔“

آل انڈیا ریڈیو کے کسی رکن سے پوچھئے ”وہ شخص؟ خصوصیت تو خیر، ویسے خوب آدمی ہے۔ اچھا ہی ہے۔ میرا مطلب ہے آپ سمجھتے ہی ہیں نا.....“

مکتبہ اردو میں بات چھیڑیئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جائے گی۔

”ممتاز مفتی؟ ممتاز مفتی ہی ہے۔ ہاں ذرا پیسوں کے معاملے میں۔ لیکن خیر، حاجت مند کون نہیں۔“

اس کے والد سے بات کیجئے۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو جائیں گے۔ پھر حقے کا ایک لمبا سا کش لے کر کہیں گے..... ”اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہاں اگر وہ اتنا خود سر نہ ہوتا اور عقل سے کام لے سکتا تو اس کی زندگی سنور ہی جاتی۔“

مٹا رہا یا یہ جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے اور دوستی کا دم بھر رہا ہے۔
دوستی کی ابتدا میں وہ آپ کی شخصیت میں انوکھے گن دیکھے گا اور ان کا آپ سے
بے تکلف اظہار کرے گا۔ ایسے انوکھے گن جن کے وجود کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ
تھا۔ آپ سمجھیں گے کہ وہ مذاق کر رہا ہے اور آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ لیکن اثر قبول
کئے بغیر اس کی باتوں کے رنگین جال سے نکل جانا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کی دلیل
کارنگ عجیب ہوتا ہے۔

”بے تعلقی، بے تکلفی اور سرراہی“ اس کی گفتگو کی تین خصوصیات ہیں۔
بظاہر وہ آپ کی شخصیت کی کسی خامی کے بارے میں بات کرے گا۔ لیکن بات کی تہہ
میں آپ کی شخصیت کی کسی انوکھی خوبی کی طرف اشارہ ہو گا اور اس رنگین اشارہ کی وجہ
سے نہیں بلکہ اس خوبی کے انوکھے پن اور منفرد نقطہ نگاہ کی شگفتگی کی وجہ سے آپ
حیران رہ جائیں گے۔ وہ نیا گن نہ جانے کہاں سے چپکے چپکے آپ کی شخصیت میں ابھر
آئے گا۔ کچھ دیر بعد آپ کو اپنے اندر اتنے نئے گن محسوس ہونے لگیں گے کہ آپ
اپنے کردار کے انوکھے پن پر ششدر رہ جائیں گے۔

آپ یہ دیکھ کر متعجب ہوں گے کہ آپ کوئی عجیب ترین شخصیت ہیں۔ چنانچہ
آپ کے اندر ایک نیا کردار بیدار ہو جائے گا۔ جب یہ نیا کردار آپ کے معمولات پر
چھا جائے گا تو مفتی دفعتاً آپ کی کمزوریاں دکھانے لگے گا۔ آپ کی ہر بات کا تجزیہ
کرے گا اور آپ کی شخصیت کے کھوکھلے پہلوؤں کو اس شدت سے اجاگر کرے گا کہ
آپ کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ نئی شخصیت استوار ہونا تو کجا آپ کی پہلی شخصیت
بھی کچی دیوار کی طرح بیٹھتی ہوئی محسوس ہوگی اور آپ کے اندر ایک بے پناہ اور لامحدود
خلا پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس امنٹ خلا کو تجسس سے پُر کرنے کی کوشش کریں گے مگر
اس سے الجھنوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کی پھینکی ہوئی کمند کو اتار
پھینکیں۔ اس کی باتوں کو بے وقعت بنا دینے کی کوشش کریں۔ جی چاہے گا کہ آپ اس
سے کہیں دور بھاگ جائیں مگر آپ بے حس ہو چکے ہوں گے۔ آپ اس کی باتوں کو نہ

اس کی بیوی سے بات کی جاتی تو وہ ہنس دیتی۔ ”اچھا! تو آپ انہیں مرد سمجھتے
ہیں؟“ اور دوسری بیوی سے پوچھئے تو وہ ہونٹ پر انگلی رکھ لے گی۔ ”ان کی بات
کر رہے ہیں آپ؟ ان کی کیا بات ہے!“

ممتاز مفتی بچپن اور سنجیدگی کا امتزاج ہے۔ چھوٹے قد کا منحنی آدمی، لمبوترہ
چہرہ، گدلی گدلی بے جان آنکھیں اور بڑا ساسر، بات کیجئے تو آپ حیران رہ جائیں گے۔
”ارے! یہ تو محض جی حضور یہ ہے۔“ احساس برتری کی ایک لہر آپ کی رگ و پے
میں دوڑ جائے گی۔ چھاتی قدرے باہر کو اینٹھ آئے گی۔

کسی موضوع پر چاہے وہ کتنا ہی مضحکہ خیز ہو، اس کی رائے دریافت کیجئے تو
نمائت خلوص اور دیانت داری سے آپ کی ہاں میں ہاں ملا دے گا۔ اس کی موجودگی
میں کسی معاملے پر بحث کر دیکھئے، چپکا بیٹھا سنتا رہے گا۔ اس سے استفادہ کیجئے تو آپ کی
ہنسی نکل جائے گی کیونکہ وہ آپ کے اور آپ کے مخالف کے ساتھ بیک وقت اتفاق کر رہا
ہو گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ نکتہ متنازعہ فیہ آپ کی حیرانی اور ہنسی کے درمیان کہیں کھو جائے
گا۔ اگر آپ ذرا سنجیدہ قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں تو آپ کو غصہ آنے لگے گا یا آپ
اسے مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔

ممتاز مفتی کو آپ اس روپ میں صرف اسی صورت میں دیکھیں گے جبکہ آپ کی
اس سے محض رسمی ملاقات ہو۔ لیکن اگر آپ اس کے دوست ہیں۔ پناہ بخدا۔ کاش
کہ میں اور ممتاز مفتی محض شناسا ہوتے۔

جب میں اس سے پہلی مرتبہ ملا تو وہ چار پائی پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ رسمی
تعارف کے بعد اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا ”مزاج اچھے ہیں؟ تشریف
رکھئے“ اور پھر سے طبلہ بجانے میں منہمک ہو گیا۔ تو یہ ہے ممتاز مفتی، میں نے سوچا۔
اب اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی شاید مجھ سے اس اُن کے فقرے کا انتقام
لے رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں سے حقیقی ممتاز مفتی کون سا ہے۔
وہ جو کچھ سال پیشتر مجھ سے متعارف ہوا تھا اور مہینوں محض واقف کار کی حیثیت سے

سننے کی کوشش کریں گے۔ ان کا مذاق اڑانا چاہیں گے۔ مگر اس کی باتیں زبردستی آپ کے اندر قیام کر چکی ہوں گی۔ آپ پر چھا چکی ہوں گی۔

آپ بے حد مظلوم اور مجبور ہو جائیں گے لیکن آپ کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہوگی کہ اس کا یہ نیارخ آپ کو اور بھی متاثر کر دے گا۔ آپ کے دل میں اس کے لئے ایک خاص جگہ پیدا ہو جائے گی اور آپ پھر اس کی طرف بھاگنا چاہیں گے۔ آپ کا جی چاہے گا کہ آپ پر یہ ظلم ہوتا رہے، ہوتا رہے۔

ممتاز مفتی ایک حالتیں بدلنے والا کیرا ہے۔ میں گر گٹ کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے پہل تو وہ آپ کو محض ایک کو یا سا نظر آتا ہے پھر آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ کیڑے کی طرح ریگ رہا ہے اور آنکھ کے جھپکے میں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک پھدکتا ہوا سنپولیا بن کر آپ کے گرد منڈلا رہا ہے۔ ان عجیب کیفیتوں کی وجہ سے اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات بہت مختلف اور دلچسپ ہیں۔

آپ مفتی سے اس کے اپنے بارے میں دریافت کریں تو وہ کندھے سکوڑ کر کہے گا ”اوہ! میں، یعنی..... میرا مطلب ہے آپ میرے بارے میں پریشان کیوں ہوتے ہیں؟“ لیکن اگر آپ اس کی ڈائری دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے بارے میں واقعی پریشان ہوتا رہا ہے۔ اس کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ ہو۔

ملتان:-

”سند باد جہازی کی طرح میرے کندھوں پر بچپن کا بڈھا سوار ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ لوگ اس بھید سے واقف ہو چکے ہیں اور مجھ پر ہنستے ہیں۔ مدت تک میں کوشاں رہا کہ لوگ مجھے ایک سنجیدہ آدمی سمجھیں اور مناسب اہمیت دیں۔ اس مسلسل کوشش کا صرف یہی نتیجہ ہوا کہ میرے ماتھے پر ایک تیوری سی ابھر آئی۔ اب میں اسے مٹانے کی ناکام کوشش میں لگا رہتا ہوں۔“

میری طبیعت بے ہنگم، بے لگام اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی نہیں، توازن نہیں، ضبط نہیں۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ کارفرما ہے، وہ جھجھک اور کمتری ہے۔ مجھ میں باقاعدہ چلنے کی ہمت نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بدک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔

میری شخصیت پر عورت کا عنصر وضاحت کے ساتھ غالب ہے۔

اگر میرا ذہن ایک پکی سڑک ہے تو دل ایک ابھی ہوئی پگڈنڈی۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں جس کی وجہ سے میری طبیعت میں توازن نہیں ربط نہیں، سکون نہیں۔ ہر گھڑی ایک کشمکش سی لگی رہتی ہے۔

میں بے حد ڈرپوک ہوں اور بسا اوقات اس خوف سے کہ میرا پول نہ کھل جائے، احتمالہ دلیری کے کام کر دکھاتا ہوں۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں اور اسی لئے اس کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے تسکین ملتی ہے۔ دل ہی دل میں دنیا سے از حد خائف ہوں اور اس بات پر مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آتا ہے۔ چنانچہ میں قطعی بے پروا ہو کر دنیا داری کو انتقاماً ایک عظیم گناہ سمجھتا ہوں۔ بلندیوں سے اس قدر ڈرتا ہوں کہ اگر مجھے کسی اونچی چٹان پر بٹھا دیا جائے تو میں اس ڈر سے بچنے کے لئے کہ گر نہ پڑوں، اپنے آپ کو نیچے گرا دوں گا۔ عورت سے ڈرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔ عشق ہو جائے تو محبوب کو ملنے کی بجائے میری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دوں۔ میری محبت کی گاڑی شک اور کمتری کے پہیوں پر چلتی ہے۔ محبوبہ کے نقاب کا ہر تار مجھے ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کنواری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی نیار کی ایک نظر پر دو شیرگی، نو خیزی، معصومیت اور الٹن تاج

دینے کو تیار ہوں۔ مجھے بد معاش عورت سے عشق ہے۔
میرا ذہن قوی، مذہبی، خاندانی اور رسمی تعصبات سے خالی
ہے۔ میں عزت اور خود داری کے جذبات سے قطعی کورا ہوں۔“

ممتاز مفتی

اگرچہ آج کا ممتاز مفتی کل کے ممتاز مفتی سے مختلف ہے لیکن بنیادی طور پر بالکل وہی ہے۔ بچپن میں وہ سوتیلی ماؤں کے زیر سایہ رہا۔ چنانچہ اس نے عمر کا پہلا حصہ اس غصے کے خلاف جہاد کرنے میں گزارا جو اس کے دل میں کثرت ازدواج کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں بچپن گزارنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ڈر اور غصہ پیدا ہو گیا اور ان دونوں جذبوں پر اس کی شخصیت کی بنیاد رکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے حد شرمیلا اور چپ چاپ ہو گیا جس سے اس کی کالج کی زندگی برباد ہوئی۔ یہ زمانہ اس نے ایلیموڈی مائی اور پیڈرو بہادر کی خاموش فلمیں دیکھ کر، سٹے سگریٹ پی کر، مونگ پھلی کھا کر اور کالج سے بھاگ کر گزارا۔ زندگی کا دوسرا حصہ اس نے ایک عورت کے اثر سے آزاد ہونے کی ناکام کوشش میں کاٹا اور زندگی کی تیسری منزل افلاس کے خلاف لڑنے میں بسر کی کیونکہ اسے پینتالیس روپے کی حقیر رقم میں آٹھ پیٹ پالنے پڑتے تھے۔

ممتاز مفتی مجلسی آدمی نہیں۔ وہ کسی کو ملنے سے بہت ہچکچاتا ہے۔ اسے گھر بیٹھے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ اگر آپ اسے کچھ کتابیں، چائے، پان، کچھ کھانے کو اور ایک ریڈیو سیٹ دے کر ایک جگہ مقید کر دیں تو اسے بہت دیر تک پتہ ہی نہ چلے گا کہ وہ قید ہے۔ اس کے برعکس اگر اسے کسی ایسی جگہ رکھیں جہاں بہت سے آدمی اور ہنگامے ہوں تو وہ گھبرا کر کہیں بھاگ جائے گا۔

گھر کا شوقین ہونے کے باوجود وہ فرمانبردار خاوند اور گھریلو مرد نہیں۔ ممتاز مفتی وقت کے احساس سے قطعی آزاد ہے۔ اس کا کلاک بھی ٹھیک وقت نہیں دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشینری ہمیشہ اپنے چلانے والے کی ذہنیت کے مطابق خصوصیات پیدا

کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا کسی نے اس کے کلاک میں کوک بھر دی۔ عموماً صبح دس بجے سوئیاں تین پر ہوں گی اور گھنٹہ چھ بجائے گا۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ صبح دس بجے سوئیاں ٹھیک دس پر ہی ہیں تو یقین رکھیں کہ گھڑی پر رات کے دس بج رہے ہیں، صبح کے نہیں۔

مقولہ ہے کہ شہر اس مقام کو کہتے ہیں جہاں لوگوں کو روپے کی قیمت کا اندازہ نہ رہے۔ اس لحاظ سے ممتاز مفتی مستقل طور پر شہر میں رہتا ہے۔ اسے فضول خرچی میں بڑی تسکین ملتی ہے۔ خصوصاً جب اس کا ہاتھ تنگ ہو تو تسکین کی خواہش اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر قرض ہی اس کی پونجی رہی ہے۔ لیکن تعجب ہے وہ کہیں نہ کہیں سے ادھار کا انتظام کر ہی لیتا ہے۔ آپ نے کیسا ہی عزم کیا ہو کہ آپ اسے کچھ نہ دیں گے مگر وہ آپ سے مانگے گا ہی کچھ ایسے انداز میں کہ آپ اپنے سارے ارادوں کو یکسر بھول جائیں گے۔ خوش قسمتی سے اس میں خود داری نام کو بھی نہیں اور اسی سے وہ اپنی سدا بہار غربت اور بدنامی کے قبیح نتائج سے بچا ہوا ہے۔ وہ..... خود داری کو ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہے مگر اس کا خیال ہے کہ خود داری کا نہ ہونا بھی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔

دفتر جاتے ہوئے اسے اکثر خیال آتا ہے کہ چڑاسیوں کو سلام کرنے کی عادت اچھی نہیں۔ اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگتا ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ آج چڑاسیوں کو سلام نہیں کرے گا اور ان کے سلام کے جواب میں صرف سر ہلا دے گا جیسا کہ ایک خود دار آدمی کو کرنا چاہئے لیکن موقعہ آنے پر اس کا ہاتھ خود بخود اٹھ جائے گا۔ ”آداب عرض!“

اگر اس کا افسر اس سے کہے ”دیکھئے صاحب! آپ نہیں سمجھتے۔“ تو سوچے سمجھے بغیر اس کے منہ سے نکل جائے گا، ”جی ہاں..... جی ہاں۔“ پھر ملاقات کے بعد دفعتاً اسے احساس ہو گا کہ چاہے وہ افسر ہے لیکن اسے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ ”میں نہیں سمجھتا۔ میں؟“

سکے گا، اس لئے وہ اسے یکسر بھول جائے گا تاکہ اسے چھپانے کی زحمت سے چھوٹ جائے۔

وہ ذہنی الجھنوں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر اسے بتایا جائے کہ وہ نوکری سے برخواست کر دیا گیا ہے تو وہ ایک لمحے کے لئے پریشان ہو جائے گا مگر فوراً ہی اپنے آپ کو اس مشکل کے لئے تیار کرے گا اور اس طرح اپنی زندگی سے الجھن اور غم کو مٹا دے گا۔ تھوڑے ہی وقفے میں وہ اس تبدیلی کے لئے اس قدر تیار ہو چکا ہو گا کہ اگر دوبارہ اطلاع پہنچے کہ وہ بحال کر دیا گیا تو پریشان ہو جائے گا اور اسے اپنی نئی سیکموں کے ضائع چلے جانے کا بہت دکھ ہو گا۔

اس کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے حادثے پر بھی سنائے میں نہیں آتا۔ عزیز ترین دوست کی موت پر بھی اسے دھچکا نہیں پہنچتا۔ ایسی خبر سن کر وہ خالی الذہن ہو جائے گا اور اس کے برتاؤ سے مترشح ہو گا کہ وہ غمزدہ نہیں بلکہ کھویا کھویا سا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے غم اس کے احساسات میں سرایت کرے گا، قطرہ قطرہ ہو کر۔ اچانک اور فوری خوشی پر بھی اس کا طبعی توازن قائم رہتا ہے کیونکہ اس نے اپنے گرد تسکین و اطمینان کا ایک خول سا بنا رکھا ہے۔

وہ زیادہ بلند امیدیں اور توقعات استوار نہیں کرتا تاکہ پوری نہ ہونے پر اسے دکھ نہ پہنچے۔ کوئی سرور کن توقع ہو تو وہ اسے بھلا دے گا۔ بھلا نہ سکے تو زیادہ اہمیت نہیں دے گا اور دل ہی دل میں امید رکھے چلا جائے گا کہ وہ توقع پوری ہو کر اسے ایک اچانک اور خوشگوار تعجب بخشنے اور اگر وہ پوری نہ ہو تو مایوسی کے صدمے سے اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ اسے سنے دیکھنے کی عادت ہے۔ عام طور پر جب اسے سائیکل پر کہیں دور جانا ہو تو رستے کی تکان سے بچنے کے لئے کسی سنے میں کھو جائے گا۔ جوانی کے زمانے میں وہ کراچی سے کراچی تک ہوائی تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کیا کرتا تھا۔ جب وہ ہوا بازی سے سیر ہو گیا تو دنیا کا مشہور کرکٹ باؤلر بن گیا اور بسا اوقات ایم سی سی کی ساری کی ساری ٹیم تینتیس رنوں میں آؤٹ کر لی۔ یہ گیند پھینکنے کا شغل

وہ اپنی حماقتوں کا اعلانیہ اظہار کرنے سے ذرا نہیں گھبراتا بلکہ اسے اپنی کئی ایک حماقتوں پر ناز ہے۔ وہ دوستی، محبت، ایثار اور قربانی کو حماقتیں سمجھتا ہے اور عام آدمی کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں عوام ذہین آدمیوں سے بہتر مخلوق ہیں۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ذہنی قابلیت حاصل ہونے سے انسانیت کی خوبی کم ہو جاتی ہے اس لئے وہ علم کو انحراف سمجھتا ہے اور جذبہ کو صراطِ مستقیم۔ اس کی رائے میں زندگی کی تمام تردیجی، رجحینی اور خوشی عوام کے دم قدم کا نتیجہ ہے۔

ممتاز مفتی حتیٰ الوسع جھوٹ نہیں بولتا مگر یہ خوبی عمدہ اخلاق کا نتیجہ نہیں کیونکہ اس کے نزدیک جھوٹ یا سچ بولنے کا عمدہ اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب لوگوں کا ڈر غالب ہو یا یہ خوف طاری ہو کہ مخاطب میں سچائی برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی محض آپ کے جذبات اور احساسات کے احترام اور اخلاق کی خاطر جھوٹ بولنا گوارا کرے گا اور جھوٹ بول کر آپ کی ذات پر بہت برا احسان کرے گا۔ چونکہ ابتداً وہ لوگوں سے از حد خائف تھا، اس لئے اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ مگر اب وہ جان گیا ہے کہ پھٹ سے سچ بول دینا لوگوں کو دھوکا دینے کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔

اس میں راز داری کی اہلیت بے شک ہے۔ مگر وہ اس اہلیت کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ اسے کسی بات کے راز رکھنے کی تاکید کر دیں، وہ بات اس کے سر پر سوار ہو جائے گی، دل پر بوجھ سا بن جائے گا، حتیٰ کہ وہ راز فاش کر دینے پر مجبور ہو جائے گا تاکہ اسے سکون مل سکے۔ اگر یہ بات آپ کے ناموس کے متعلق ہے اور اس کا راز رہنا ضروری ہے تو وہ کسی کو اعلانیہ تو نہیں بتائے گا مگر چھپا کر بھی نہیں رکھ

سے ملنے کے لئے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ بیماری اس قدر پرانی ہے کہ اسے اس کی ابتدا کی ماہیت کے متعلق کچھ یاد نہیں رہا اور اب وہ اس کا اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر جو بیک وقت معالج، فلسفی اور درویش تھا، یہ سن کر خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ پھر علاج کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مفتی ڈاکٹر کی بات سے اس قدر متاثر اور محفوظ ہوا کہ دوائی کے بغیر ہی لوٹ آیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی بھول کر بھی علاج کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کی زندگی کا زیادہ وقت چیزیں ڈھونڈنے میں گزرا ہے۔ مثلاً پنسل بنانے کے لئے وہ چاقو کی تلاش کرے گا اور اس تلاش کے دوران میں قطعی بھول جائے گا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ بفرض محال چاقو اس کے ہاتھ آجائے تو اس کی پنسل گم ہو جائے گی اور وہ اس پنسل کو ڈھونڈنے میں کھو جائے گا جو اُن جانے میں اس نے کان پر اٹکالی تھی۔ گھر میں اسے ننگے پاؤں، اُن دھلے منہ اور بالوں کے گنجل کے گنجل بکھرائے پریشان پھرتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے بغلیں ہو کر رو دیں۔ کام کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا سارا وقت ادھر ادھر کی معمولی ضروریات کو پورا کرنے میں کتنا ہے اور کام ایک ضمنی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ چند ہی سطریں لکھ کر وہ پانی کا ایک گلاس پیتا ہے اور پھر پان کھاتا ہے، پھر پیشاب کرتا ہے اور پھر پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک گھنٹے میں بیس سطریں لکھتا ہے، چار گلاس پانی پیتا ہے، دو پان چباتا ہے، دو دفعہ پیشاب کرتا ہے۔ اکثر دو ایک سگریٹ بھی پی لے تو مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود اگر اس کی بیوی اس چار پانی پر گڈمڈ شخص سے جو ہر وقت اس سے پانی، پان، سگریٹ ایسی چیزیں مانگتا رہتا ہے، تعلق قائم رکھنا چاہتی ہے تو تعجب کا مقام ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کی بیوی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی کیونکہ ممتاز مفتی ایک اچھا خوند ہے۔ لیکن ٹھہریئے یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔

بھی کچھ زیادہ دیر تک دلچسپ نہ رہ سکا، اس لئے اس نے دیپک راگ کی صحیح بندش کھوج نکالی۔ وہ مجموعوں میں اس راگ کا الاپ کیا کرتا۔ دیپک کی جلتی ہوئی تانوں سے اہل محفل کے دل سلگ سلگ جاتے، بتیاں جل جل اٹھتیں اور لوگ حیرانی سے بت کے بت بنے ٹکٹے رہتے۔ آج کل اس کے خواب بین الاقوامیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایسی عجیب شعاعیں ایجاد کر رکھی ہیں جن کی مدد سے وہ بارود کو پھٹنے سے روک سکتا ہے اور ان شعاعوں کی مدد سے وہ آج کل دنیا کے امن کو محفوظ کر رہا ہے۔ مگر ان سپنوں میں اس نے کبھی روپے اور حکومت کے حصول کا پروگرام نہیں بنایا، اگرچہ اسے یہ بھی پسند ہے کہ خرچ کرنے کے لئے اسے روپیہ مل جائے۔ لیکن اگر اس کے پاس بہت سارا روپیہ آجائے تو اس کی زندگی کا آدھا لطف ختم ہو جائے گا۔ آج کل اس کی صرف یہی آرزو ہے کہ اس کے پاس ایک ریڈیو سیٹ ہو۔ کار یا بنگلے کا مالک ہونے کی خواہش اس میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے آپ کو بڑا آدمی یا حاکم تصور کرنا اسے قطعی پسند نہیں۔ چند ایک امیرانہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا بشرطیکہ اس کی موجودہ حالت جوں کی توں رہے۔ اس کی موجودہ زندگی بے پرواہی اور مفلسی کا امتزاج ہے۔ عمر اس کے سامان میں ایک چٹائی، ایک بستر، ایک ٹنک اور دو ایک کرسیاں شامل رہیں۔ اس کے گھر اور کردار کی سب سے بڑی خصوصیت بے ترتیبی ہے۔

وہ صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھتا ہے اور اس جگہ سے اٹھ کر جہاں سویا ہوا تھا، کسی اور جگہ پر جا کر پھر سو جاتا ہے اور پھر چائے دانی کی کھنک سنے بغیر آنکھیں نہیں کھولتا کیونکہ چائے پینے کی اسے لت ہے۔ حلق میں پہلا پیالہ انڈیلنے کے بعد اس کے ارد گرد کی دنیا بیدار ہونے لگتی ہے تا آنکہ چیزوں کی ماہیت کا تناسب پوری طرح قائم ہو جاتا ہے۔ وہ دن میں دو بار چائے کو پانی کی طرح ٹھنڈا کر کے پیتا ہے۔

سٹرانگ چائے پی پی کر اسے بار بار پیشاب کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اس شکایت سے عاجز آکر ایک دفعہ اس نے ایک مشہور و معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر

رہا..... اور آج ان جھیلوں سے قطعی طور پر آزاد ہو چکا ہے۔

اس کی روزانہ زندگی میں سستی کا جذبہ بے حد کارفرما ہے۔ وہ اپنی کاہلی اور ناکارہ پن کو جانتا اور اعلانیہ تسلیم بھی کرتا ہے۔ وہ سارا دن کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا مگر شام تک مجموعی طور پر کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ بہت ضروری کام کرنا ہو تو اس وقت اس کا دل ایک ایکٹ کے ڈرامے پڑھنے کے لئے مچل جائے گا۔

نفسیاتی مقالہ لکھتا ہو تو راگ کی کتاب لے بیٹھے گا۔ کہانی لکھنے کی اشد ضرورت درپیش ہو تو نفسیات پڑھنے لگے گا۔ چھوٹی عمر ہی سے اسے راگ سے عشق ہے۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک مقامی میوزک کالج میں داخل بھی ہوا لیکن انہی دنوں کالج میں ایک مدراسی آنے جانے لگ گیا جو راگ کا دیوانہ تھا۔ اتفاقاً وہ مدراسی ہندوستانی نہیں سمجھتا تھا اور راگ ماسٹر انگریزی سے بے بہرہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کی ترجمانی کرنے کا فرض مفتی کو ادا کرنا پڑا۔ وہ راگ کا دیوانہ گانے کی دھن راگ ماسٹر سے سیکھ لیتا اور پھر ممتاز مفتی سے گانے کے بول انگریزی میں ترجمہ کروا کر عجیب معنی خیز انداز میں گانا شروع کر دیتا۔ ”بلیے سٹ ڈاؤن ان دائرین کوائٹ لی۔ آر آئی ول گو یو اے سلیپ۔ بلیے.....“ اس دلچسپ راگ سکشا میں مفتی کو اس قدر مزہ آنے لگا کہ خود سیکھنے کی بات پس پشت پڑ گئی۔ بعد ازاں اس نے راگ کا غائر مطالعہ بھی کیا اور نٹروں کے تموجات، ٹیپرڈ سکیل، آر وہی امر وہی سبھی معلومات حاصل کر لیں اور اب وہ راگ کو پورے طور پر سمجھتا ہے۔ آپ صرف اسے اتنا بتادیں کہ کیدارا گایا جا رہا ہے۔ پھر وہ فوراً اسے پہچان لے گا اور سچا اس کی وکر چل اور جذبات پیدا کرنے والے اتار چڑھاؤ سے محظوظ ہونے لگے گا۔ نہ سمجھے تو بھی وہ راگ سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ کچھ دن راگ سننے کے بعد اس کے دل میں شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ کچھ لکھے یا کرے۔ راگ سے اسے تسکین ملتی ہے، ایسی تسکین جو اس میں ایک تعمیری اضطراب پیدا کرتی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے گرد و پیش کی ہر ایک چیز میں ایک عجیب سی دور رخ کو

ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے جو یہ پسند نہیں کرتا کہ اسے کوئی بچہ سمجھے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کرے اور اسے مناسب وقت پر مناسب کام کرنے پر مائل کرے لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہو کہ اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی دیکھ بھال کی جارہی ہے۔ اگر اسے شک پڑ جائے کہ اس سے ایک بچے کا ساسلوک کیا جا رہا ہے تو اس میں سویا ہوا مرد بیدار ہو جائے گا اور اپنی تحقیر کے خلاف جہاد کرے گا کیونکہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنا اسے قطعاً گوارا نہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کی بیوی اس سے عام بیویوں کا ساسلوک کرے اور ڈر کر رہے تو وہ اسے جاہل، عکشی اور بے عقل سمجھنے لگے گا۔ اسے گھریلو جھگڑوں سے اس قدر نفرت ہے کہ بسا اوقات وہ جھگڑے کے خطرے کو روکنے کے لئے اپنی بیوی سے جھگڑا چھیڑ لیتا ہے۔

ممتاز مفتی نے زندگی میں دو بار محبت کی ہے۔ پہلی دفعہ جب وہ محض ایک نکما لڑکا تھا اور اسے اپنا کوئی بہتر مصرف سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کے گرد ایک بیگنہ اور بے پرواہ دنیا بکھری پڑی تھی۔ ایک ایسی دنیا جس میں نہ تو اس کی کوئی حیثیت تھی، نہ وقعت۔ اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے اس نے یہ روگ لگا لیا۔ اس کی پہلی محبت کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ تعمیری نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا انداز محبت بذات خود تخریبی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمر بھر کے لئے اس کے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکہ لگ گیا۔ اس کے ذہن میں ایک دائمی کشمکش کی داغ بیل پڑ گئی۔ محبت کے لئے وہ اپنے اقربا کے ساتھ ساتھ اپنے آپ سے بھی برسر پیکار رہا۔ وہ اپنی محبوبہ سے بیک وقت بخونانہ محبت اور نفرت محسوس کرتا تھا۔ اس کی دوسری محبت درحقیقت اپنی پہلی محبت سے چھٹکارا پانے کی ایک شدید کوشش تھی۔ اس کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب ہو گیا۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوئی صورت نہ پا کر انتقاماً پھر سے اسی پہلے جھیلے میں جا پھنسا۔ تعجب کی بات یہ نہیں کہ وہ شدید ذہنی کرب اور رسوائی میں کیسے زندگی گزار سکا بلکہ یہ کہ وہ ان مشکلات کے باوجود جیتا

شدت سے محسوس کیا۔ وہ اس بات کو جان کر حیران ہوا کہ آدمی کے دل میں بیک وقت مختلف اور متضاد خواہشات اور رجحانات موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ فطرت کی عجیب ترین چیز سے بھی عجیب تر ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اردو ادب اس حیران کن دورنگی سے قطعاً ناواقف ہے۔ اردو ادب نے نفس لاشعور کی آرزوؤں کو ابھی نہیں پہچانا۔ محبت کو محض آرزو کے سوا کچھ نہیں سمجھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے دل میں لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ممتاز مفتی زیادہ تر داستاوسکی، یونگ ایڈلر، برٹریڈ رسل اور فرائیڈ کی تحریروں سے متاثر ہوا۔ نفس لاشعور کی ڈھکی چھپی باتوں کا اظہار کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس لئے ممتاز مفتی کو آج تک اپنی تحریروں کے متعلق یہ یقین پیدا نہیں ہوا کہ وہ ان آن کی باتوں کا اظہار کامیابی سے کر سکا ہے یا نہیں۔ پھر بھی اسے تسکین ہے کہ وہ قادی کی توجہ تو اس طرف مبذول کر سکا ہے۔

پیش لفظ

چُپ میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے جسے مکتبہ اردو نے پہلی بار ۱۹۴۷ء میں تقسیم سے پہلے شائع کیا اور اب فیروز سنز لاہور دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے میں نے اس زمانے میں لکھے تھے جب میں سکول میں پڑھاتا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک میں مختلف سکولوں میں پڑھاتا رہا۔

۱۹۳۶ء میں، میں نے افسانہ نویسی کی ابتدا کی۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ لکھنے کا شغل اپناؤں گا۔ اردو زبان اور ادب سے میں ناواقف تھا لیکن حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ لکھنا مجھ پر عائد ہو گیا۔

لکھنے کے لئے جس موضوع کو میں نے اپنا یا، اس دور میں وہ پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ خصوصاً ایک سکول ماسٹر کا ایسے موضوع پر لکھنا ناقابل معافی فعل تصور کیا جاتا تھا۔

اساتذہ کرام صرف اسلامی یا اخلاقی موضوعات پر لکھنے کی اجازت دیتے تھے۔

دس سال میں چوری چھپے ممتاز مفتی کے نام سے افسانے لکھتا رہا۔ سکول میں میرا نام ممتاز حسین تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ممتاز مفتی کون ہے۔ میں نے دس سال کبھی کسی ادبی محفل میں شرکت نہیں کی تھی۔ ان حالات میں میرا مجموعہ چھپنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

میرا پہلا مجموعہ ان کی ۱۹۴۳ء میں مکتبہ اردو لاہور نے شائع کیا۔ یہ بھی ایک حسن اتفاق تھا کہ تین مجموعے تو چھپ گئے لیکن مصنف گمنا رہا۔

سکولوں میں درسی کتابوں کے پبلشر آیا ہی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آیا کرتے تھے۔ ان میں ایک صاحب چودھری برکت علی تھے۔ چودھری برکت علی بڑے منفرد کردار کا مالک تھا۔ بڑا خود اعتماد تھا۔ منہ پھٹ تھا، دلیر تھا، اساتذہ سے ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی تھا۔

ایک روز وہ مجھے انگلی لگا کر ایک طرف لے گیا۔ کہنے لگا میں تجھے ایک آفر دیتا ہوں۔ تو ہمارے لئے اردو سے انگریزی میں ترجمے کی ایک کتاب لکھ دے۔ بول کیا کہتا ہے۔

میں نے کہا چودھری کسی لائق استاد سے لکھوا۔

وہ غصے میں بولا۔ کس سے کون سی کتاب لکھوانی ہے، اس کا فیصلہ ہم خود کرتے ہیں۔ ہم پبلشرز بڑے ویل انفارمڈ ہوتے ہیں۔ تیری تنخواہ کیا ہے؟ اس نے پوچھا۔

پینتالیس روپے۔ میں نے جواب دیا۔

ہم تیس تین ہزار روپے معاوضہ دیں گے۔ تیری چھ سال کی تنخواہ۔ ڈیڑھ ہزار ابھی محلہ کرنے پر اور باقی جب تو مسودہ دے گا۔ بول کیا کہتا ہے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔

تیرا دماغ تو ٹھیک ہے مسٹر۔ وہ چلایا۔

میرا دماغ ٹھیک نہیں۔ میں نے کہا۔

تو پاگل ہے۔ وہ چلایا۔ ہم ایسی آفر کسی کو نہیں دیتے لیکن تُو یا تو احمق ہے اور یا پاگل۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ چھ ماہ کے بعد وہ پھر آگیا۔

انگلی سے مجھے اشارہ کیا۔ میرے ساتھ چل۔ وہ ایک ہوٹل پر رک گیا۔ بولا پہلے طعام پھر کلام۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں کہا ممتاز مفتی میں نے تیری چودہ کمائیاں حاصل کر لی ہیں۔ تین کمائیاں تو دے دے اور ہم تیرا مجموعہ شائع کر دیں گے۔

میں نے بات کرنے کی کوشش کی۔
فضول آئیں باتیں شائیں نہ کر۔ میں نے پوری تحقیق کر لی ہے اور دیکھ ہم پبلشرز راز رکھنا جانتے ہیں۔

ٹیکسٹ بک کے علاوہ ہمارا ایک ذیلی ادارہ بھی ہے، مکتبہ اردو، جو ادبی کتابیں شائع کرتا ہے لیکن خوش فہمی میں نہ رہنا۔ مجموعے کے چھپنے پر تجھے زیادہ سے زیادہ تین سو روپے رائلٹی ملے گی۔ یوں مجھے حسن اتفاق سے ایک پبلشر مل گیا ورنہ ان حالات میں میرا مجموعہ شائع ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ممتاز مفتی

جولائی ۱۹۹۲ء

نیلی

ہائے ری کیسا پیارا بچہ تھا آپا کا ۔ بھورا بھورا ۔ جیسے زرد روٹی کا کالا ۔
 چھوٹے چھوٹے گندے سے ہاتھ اور استنا بڑا سر ۔ جی چاہتا تھا چھاتی سے لکائے
 پھروں ۔ پر توبہ ! بھائی جان کی اتناں نے کتنا پاکھنڈ چھایا تھا ۔ بڑی آئی تھی تھے
 کی مالکہ ۔ ہونہہ ! گویا اپنی گرہ سے خریدا تھا اُسے ! توبہ اس بڑھیا کی باتیں !
 مجھے تو ہنسی آ جاتی سن کر ۔ دانت ہوں تو کوئی بات بھی کرے ۔ یوں بولتی تھی
 جیسے بگڑی ہوئی چکی پھپھہ پھپھہ ۔ بولی ”پھیضہ کونہ دو ۔ گرانہ دے“ ۔ بڑی آئی
 تھے کی رکھوالی ۔ نہ جانے کیا سمجھتی ہے وہ مجھے ۔ جیسے میں دودھ پیتی ہجی
 ہوں ۔ ہونہہ ! بھائی جان نے بہتیرا کہا ۔ لینے دو فیضو کو ذرا ۔ کیا حرج ہے ۔
 لیکن وہ بڑھیا ! ! ۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ تھے کو اٹھا کوٹھے پر چڑھ جاؤں اور
 ۔۔۔ اور ۔۔۔ ہائے میں کیوں پھینکتی اسے ، کلچے سے نہ لکائے رکھتی ۔ ایسا
 پیارا بچہ ہے نیلی نیلی کانچ سی آنکھیں ۔ زعفرانی رنگ اور پھر لاکھے سنہری بال
 جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتی ہی رہوں ۔ گڈا تھا گڈا ۔ ذرا نہ روتا تھا بس روٹی
 صورت بنائی ہونٹ نکالے اور آنکھیں ! ! ۔۔۔ اس وقت اس کی آنکھیں ! !
 ۔۔۔ جیسے نیل میں گہرا رنگ گھول دیا ہو ۔ اور پُھول سی آنکھیں ۔ جیسے کوئی
 سبز پھول کھل گیا ہو ۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا ۔

تھے کی آنکھیں تو اک تماشائی حوئی تھیں ۔ جو کوئی آتا اس کی آنکھوں کی
 طرف دیکھ دیکھ کر کہتا ۔ نہ جانے کس پر گیا ہے یہ تھا ۔ ہمارے خاندان میں تو
 کسی کی آنکھ نیلی نہیں اور پھر ایسی نیلی ۔۔۔ یہ بات بھی سچی تھی ۔ آپا کا بیٹا
 اپنے ہی خاندان میں ہوا تھا ۔ بھائی جان ، آپا اور میرے پھوپھی زاد تھے ۔ اور
 ہمارے گھروں میں تو سب ”کل نینے“ تھے ۔ بھائی جان کی آنکھ کبھی کبھی شربت
 جھلک مارتی تھی وہ بھی صرف مسکراتے وقت ، مگر وہ مسکراتے ہی کہاں تھے ۔

آپا کی تو گھور کالی تھیں سیاہ ! اور توہ !۔۔۔ کیسی موٹی موٹی !! آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آپا نظر بھر کر دیکھتی تو دوسرا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا میں تو سُن ہو جاتی تھی۔ پھر نہ جانے مجھے کیوں غصہ آ جاتا۔ اور میں چیختی۔ ہم پر تو نہ نکال کرے کوئی آنکھیں۔ اس بات پر بھائی جان مجھے چھیڑتے۔ ”نہ بھئی صفی۔ فیضو کو نہ دکھایا کرو آنکھیں“۔ ”واہ آپ تو مذاق کرتے ہیں“۔ میں کہتی۔ اور وہ ہن کر کہتے توہ فیضو تمہاری آپا نظر بھر کر دیکھتی ہے تو اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ اور تم ! تم دیکھتی ہو تو پھوار پڑنے لگتی ہے۔ ”اوس“ میں چڑ کر کہتی ”کہاں پڑتی ہے پھوار۔ میں جانتی ہوں بناتے ہیں آپ“ پر بھائی جان کا اور معاملہ تھا۔ ان کی بات مجھے بری نہ لگتی تھی۔ اور وہ صرف مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے۔ گھر میں تو انہیں چپ لگی رہتی تھی۔ آپا سے کبھی یوں بات بھی نہ کی تھی جیسے دولہا دلہن سے کیا کرتا ہے۔ پھر وہ کچھ اور کہتے تو میں چیختی ”ہس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی“۔ پر میرے دل میں ذرا بھی غصہ نہ آتا۔ ویسے میں یوں منہ موڑ لیتی جیسے۔۔۔۔۔ پر نہ جانے وہاں سے چلے آنا کیوں میرے لئے اس قدر مشکل ہو جاتا تھا۔ میں جانوں۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتہ کیوں۔۔۔۔۔

توہ ! بھائی جان کی اماں نے تجھے کی آنکھوں پر کیا پانکھنڈ مچایا تھا۔ بولی ”یہ انگریج کہاں سے آگیا۔ اوئی اماں دیکھو تو“ نجمہ چلاتی ”اب تو ہری ہوئی جا رہی ہیں۔ توہ۔۔۔۔۔ ! اور آپا بولتی ”آنکھیں نہ ہوئیں گرگٹ ہوا“۔ ادھر ہماری ملازمہ بانو شور مچاتی ”دیکھو تو بی بی کیسا جافرانی رنگ ہے۔ اور بال تو سونے کی تاروں میں“۔ ”اونہوں“ بڑھیا بڑبڑاتی۔ ”یہ تو لاکھے سنہری ہیں“۔ آپا ان کی باتیں سُن کر نہ جانے کیوں شرما اور چڑ جاتی تھی۔ شرمائے کی بات ہی کیا تھی اس میں۔ آخر سبھی کے ہاں بچے ہوتے ہیں۔ پر آپا کا پہلا تھا تھانا۔ اس وقت آپا کی آنکھیں اور بھی گھور ہو جاتیں جیسے گھٹا چھا جائے۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی یا چہرے پر دوپٹہ ڈال کر چھپ جاتی۔ آپا بھی عجیب ہے۔ پر میں جانوں گھبرائے کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتی بھی تھی۔ لیکن چھپ چھپ کر۔ پھر کوئی نہ کوئی چٹا اٹھتی۔ ”نہ جانے کس پر گیا ہے تھا۔ پورا انگریج ہے انگریج“۔ یا

کوئی ناواقف آتی تو وہ تجھے کو دیکھ کر غور سے آپا کی طرف دیکھتی۔ اور پھر تجھے کی طرف جیسے حیران ہو رہی ہو۔ جی بھی تو آپا کو لوگوں کا آنا جانا پسند نہ تھا۔ اور وہ بات بات پر کہہ اٹھتی ”توہ یہ میرا سر رکھا جاتی ہیں“۔

تجھے کی آنکھوں۔ رنگ اور بالوں کے بارے میں اگر کوئی خاموش تھا۔ تو وہ بھائی جان تھے۔ کسی نے تجھے کی آنکھوں یا صورت کا ذکر چھیڑا اور وہ بہانے بہانے اٹھ کر وہ گئے۔ جیسے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو اس بات میں۔ بات سن کر ان سنی کر دیتے تھے۔ اور گھر میں تو بس یہی اک بات چلتی تھی ان دنوں تجھے کی آنکھیں رنگ اور بال سبھی اسی بات کے دیوانے ہو رہے تھے۔ بھائی جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا تجھے کی طرف۔ اسے پیار بھی کرتے تو دھیان کسی اور طرف ہوتا۔ میری طرف یا جیسے دیوار سے پار کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان آنکھوں کا بھید جاتے ہوں۔ یا جیسے اسے اپنے آپ سے چھپا رہے ہوں۔ یہ بات نہ تھی تو پھر وہ ہماری باتیں سُن کر دکھی کیوں ہو جاتے تھے۔ جیسے پھوڑے کو چھیڑ دیا جائے۔ اور اس وقت مسکراتے بھی تو وہ کیا مسکراہٹ ہوتی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی !!

اس روز وہ کس قدر گھبرائے جب اماں کہنے لگیں ”پھیضہ کس پر گیا ہے تھا“۔ اور کنکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ یہ سن کر بھائی جان گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ پھر آپا بولی۔ ”مجھے کیا معلوم انہیں سے پوچھئے“۔ اس نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور لگی مسکرانے۔ بھائی جان کا رنگ اڑ گیا۔ بڑی اماں کب چھوڑنے والی تھی۔ بولی ”کیوں جلیل کس پر گیا ہے تھا۔ دیکھ تو ذرا“ بھائی بولے ”اماں میں پوچھتا ہوں وہ میرا پن کہاں گیا۔ جانے کس نے اٹھا لیا ہے۔ کیا مصیبت ہے“۔ ”اے بے جائے کا کہاں مل جائے گا۔ تو ذرا اپنے بیٹے کو تولے۔ دیکھ تو تیری طرف ہی دیکھ رہا ہے“۔ ”لیکن کیا کہاں میرا پن“ بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”توہ یہ آج کل کے لڑکے“۔ بڑی اماں بڑبڑاتی۔ ”بیٹے کے نام سے

تو چڑ ہے انہیں اور اس کی اماں کو چاہے کندھوں پر اٹھائے پھر یں۔ آپا تڑپ کر مڑی۔ اس نے بکاہ بھر کر بڑی اماں کی طرف دیکھا۔ توبہ وہ ایک بکاہ! جیسے چینیوں بھری ہوئی ہوں۔ پھر آپا نے منہ موڑ لیا۔ بھلا بڑی اماں کی طرف یوں دیکھنے سے فائدہ۔ آپا بھی تو ہلکی ہے۔ وہ بڑھیا تو مٹی کی بنی ہوئی ہے مٹی کی۔ وہ تو کہی ہوئی بات کو بھی نہ سمجھے جب تک اس بات کو بار بار ڈھولک کی طرح نہ پیٹو۔ نہ جانے سبھی بوڑھی ہو کر مٹی کی کیوں ہو جاتی ہیں۔ ہائے۔ مجھے تو موت آجائے بڑھاپا نہ آئے۔ میں تو جیتے جی مر جاؤں۔ یوں مر کر جینے کا مزہ؟

آپا کے دکھ کو کون نہیں جانتا۔ اب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں بند کرے تو؟ پر جاتے سبھی ہیں۔ گو آپا نے کبھی ہونٹ تک نہیں ہلائے۔ بس یہی ہے نا، کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو آپا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس گھور گھٹا کو چھپا لیا۔ اور کسی نہ کسی طرف اکیلے میں جا بیٹھی۔ یا بھائی جان نے آپا کے شوق بھرے سوال کے جواب میں یوں منہ پھیر کر کسی معمولی سی بات کو چھیڑ دیا اور آپا کا سوال آن سن کر دیا۔ اور پھر بے اعتنائی سے باہر نکل گئے۔ تو ایک آن کے لئے آپا کی آنکھیں پھلکیں اور پھر تیرنے لگیں۔ اور اُس نے منہ موڑ کر اس پھوٹی جوڑے کو چھپ لیا۔ اور تو اور مجھ سے بھی چھپاتی تھی۔ وہ سمجھتی ہو گی میں بچہ ہوں۔ مجھے ان باتوں سے کیا۔ کیوں میں کیا بچہ ہوں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں اور ابھی بچہ۔ وہ تو خود بچہ ہے۔ ایک ذرا سے میاں کو اپنا نہ سکی۔۔۔ سبھی اندھے ہیں۔۔۔ کیا آپا اور کیا کوئی اور۔ امی بھی تو چھپایا کرتی ہے مجھ سے بات۔ لیکن میں بھی بات جانے بنا نہیں رہتی۔ کیوں رہوں؟ پھر وہ چھپاتے کیوں ہیں مجھ سے؟ وہ نہ چھپائیں تو میں بھی نہ کریدوں۔ آپا تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ جبھی تو لڑا کرتی ہے مجھ سے۔ فیضو تو بھی کریدے بنا نہ رہ سکی۔ توبہ یوں کسی کو بھرے گھر میں سے خارج کر دینا۔ نہ جانے کیسے ہیں یہ لوگ۔ کیا امی اور کیا ابا۔ کہتے ہیں کھاؤ پیو ہنسو کھیدو لیکن گھر میں کوئی بات ہو تو پہرے بن جاؤ۔ اندھے ہو جاؤ۔ اور سن بھی لو تو سن کر یوں بھیگی بلی بنی بیٹھ رہو۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

نا بھٹی۔ ہم سے تو نہیں بنا جاتا بھیگی بلی۔ اس سے تو ویرانے میں جا رہنا ہی اچھا ہے۔ نہ بھٹی ہم سے تو جیتے جی مرانہ جائے گا۔ کہ دیکھ بھی لو اور پھر جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ سن لینا پر نہ جانتا! تو بھی!! یہ بھی ہو سکتا ہے کیا۔ یوں سننے کو تو ہماری چتری مرغی بھی سنتی ہے۔ مزا تو جب ہے کہ بات سن کر اسے جان لیا جائے جیسے وہ آپ مینتی ہو۔ پھر پتہ چلتا ہے بات کا۔ اور وہ بات ہی کیا جو اندر جا کر ناپنے نہ لگے۔ یا کچھ توڑ پھوڑ نہ دے۔ یا کہیں آگ نہ لگا دے۔ وہ نجمہ ہی ہے۔ بھیگی بلی!! : جو سنتی بھی رہتی یوں ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ مکار کہیں کی!! ہونہہ!!

کیا میں نہیں جانتی کہ بھائی جان آپا سے میناہ کرنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے ابا اور اس بڑھیا نے زبردستی انہیں آپا سے جوڑ دیا۔ جیسے ٹنگے میں ٹٹو جوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ابا کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ بات یوں ہے۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے۔ جیسے دوسری شادیاں ہوتی ہیں ویسی ہی ہے یہ شادی۔ بھائی جان بھی تو ابا کے سامنے جا کر یوں بیٹھ رہتے منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر۔ جیسے بڑے اکیل

ہوں۔ توبہ! کیسے مکار ہوتے ہیں مرد۔ کتنے بہروپ دھار سکتے ہیں۔ پر اڑتی اڑتی یہ بات ہم تک پہنچ ہی گئی تھی۔ آخر چھپتی کہاں ہے چھپانے سے ایسی بات۔ جو بھی آتی امی کے کان میں منہ دے کر بیٹھ جاتی۔ اور جب بھی کوئی امی سے منہ جوڑ کر بیٹھتی اور پھر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی۔ اور مجھ سے کہتی ”اے ہے لڑکی تم اب کھیلنا جا کر“۔ اور امی فوراً یہ کہتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی۔ ”فیضہ بیٹی اب دو لفظ پڑھ لو نا بیٹھ کر“ تو میں جھٹ ساڑ جاتی کہ کوئی بات ہوگی۔ بس پھر تو میرے تن بدن میں چیونٹیاں چلنے لگتیں۔ جیسے رگوں میں بات رینگ رہی ہو۔ سر سر کر رہی ہو۔ بات، بات، بات، اور دل یوں بھٹا۔ سن! سن! سن! پھر نہ سننا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا میرے لئے۔ دیوار کے پیچھے کھرکی کی اوٹ میں۔ باورچی خانے کی ڈولی کے پیچھے۔ بھائی جان کے کمرے میں میز کی اوٹ میں۔ اور آپا کے کمرے میں ہو تو کھرکی کی درز میں سے۔ وہاں سے تو کہنے والی کا منہ بھی دکھتا تھا۔۔۔ ہائے

لاج کا خیال نہیں تو پھر یہاں رہنے کا مطلب۔۔۔ پھر بڑی اماں ڈاکٹر بھائی کی منتیں کر رہی تھی۔ ”آپ ہی سمجھ جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ اسے بے جوان لڑکا ہے۔ اگر۔۔۔!!“ پھر ماں بیٹے کے پاس گئی۔ منتیں کرتی رہی۔ پھر ان کے ابا اندر چلے گئے۔ اور لگے گھورنے۔ بہت چھپا چھپا کر رہے تھے بات ہو نہ! ساری دنیا جانتی تھی کہ بھائی بگڑے ہوئے ہیں اور کوئی رسم ادا کرنے کو نہیں مانتے۔ میں سب سمجھتی تھی۔ آپا کو زبردستی اس دھول پر منڈ دیا تھا۔ اور آپا۔ دم پخت دیک کی طرح ڈھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ جیسے لجائی ہوئی ہو۔ ہونہ لجائی۔۔۔ میں کیا جانتی نہیں۔ سبھی یونہی بھیک بلی بن کر بیٹھ جاتی ہیں سسرال میں۔ جیسے بہت لجا رہی ہوں۔ بڑی لجانے والی!! چاہے دل میں چوہے ناچ رہے ہوں اور بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں! اس لئے تو نہیں بیٹھ رہتیں کہ بیٹھنے میں مڑا آتا ہے انہیں۔ میں جانوں ڈرتی ہیں کہ کہیں اٹھ کر ناچنے نہ لگیں خوشی سے۔۔۔ پر آپا!! آپا کس بات پر لجاتی۔ میں نے ایک بار پلہ اٹھا کر دیکھا تو آنسو! اتنا بڑا آنسو۔۔۔ ہائے میرا دس بیٹھ گیا اور میں پٹ گئی آپا سے۔ اپنے اپنے انداز میں کوئی شرم کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتی ہے اور کوئی آنسو کی اوٹ میں۔ آپا سبھی کچھ جانتی تھی۔ نہ جانے آپا کو بات کیسے معلوم ہو جاتی تھی اور پھر بیٹھے بٹھائے! میں سارا سارا دن ماری ماری پھرتی کبھی ڈولی کے پیچھے کبھی میز کی اوٹ میں تب کہیں جا کر پتہ چتا کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جان جاتی جیسے کان میں ریڈیو لگا ہو۔ خوشی کی بات ہو تو مسکراتی پھرتی اور ایسی ویسی ہو تو چھلکی ہوئی آنکھیں چھپاتی پھرتی۔ بیٹھے بٹھائے بات پا لینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ ایک دن مجھ سے بولی۔ ”فیضی یہ کیا عادت ہے تیری۔ یوں لوگوں کی باتوں پر کان لگائے رکھنا۔ کسی کی بات میں دخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔“ مجھے غصہ آگیا میں نے کہا۔ ”پھر تم کیوں دیتی ہو میری بات میں دخل۔ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ بڑی مکے سے آئی ہوئی تو دیکھو“ اور میں نے آپا کا منہ چڑا دیا۔

پہلے پہل تو بھائی جان آپا سے پرلوں کی طرح پیش آئے۔ ایک جگہ بھی

تو نہ بیٹھتے تھے وہ دونوں۔ آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے۔ اور وہ باہر آگئی تو یہ کمرے میں چلے گئے۔ بہانے بہانے۔ ہائے بیچاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہ جاتی تھی اس کے بعد آپا کو چپ لگ گئی نہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ جب بھائی کسی کام کو کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ ”اوہ۔ میں تو بھول ہی گئی۔“ اور باہر نکل گئی۔ اور وہ باہر آئے تو ادھر ادھر ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو چہرے سے ظاہر ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپا جل گئی ہے بھائی جان سے لیکن تو۔۔۔ آپا۔۔۔ آپا جل جانے والی کہاں وہ تو سلگنا جاتی ہے اور بس۔ بھٹی ایسا بھی نہ ہو کوئی۔ اٹھتی اور چل پڑتی لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی انہیں۔ جیسے جی چاہتا ہو۔ اب بھی بلا لیں تو بیٹھ جاؤں۔ نہ جانے کے لئے بہانہ ڈھونڈتی تھی۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ عورتیں کیوں مانتیں ہیں۔ رہے جاتی ہیں۔ اور ویسے دیکھنے میں چھوٹی موٹی۔ ہٹو ہمیں شرم آتی ہے۔ نخرہ۔ بھٹی میں تو کبھی نہ یوں مرنوں کسی پر۔

آخر بھائی جان کی اکڑفوں ٹوٹ ہی گئی۔ اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہو سکی۔ جیسے بڑی آپا کے گھر میں۔۔۔ ہائے بڑی آپا کے گھر میں تو میلا لگا رہتا ہے جیسے چینی کا ڈھو کھلا ہو۔ یہ آئی۔ وہ گئی۔ اور وہ دونوں یوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے میاں بیوی تو ہیں ہی نہیں۔ اک تاشا لگا رکھتے ہیں۔ اس نے چھیڑا اور اٹھ بھلکی اب وہ پکڑ رہے ہیں۔ اب چوٹی سے پکڑ کر کھیٹ رہے ہیں۔ اور اُس نے چیخ ماری۔ جیسے کوئی مر رہا ہو۔ ادھر پڑوس میں دیوار پر سے اماں نصین جھانکی ادھر چوبارے کی کھڑکی میں ملک صاحب کی ماں آکھڑی ہوئی۔ کیا ہوا کیا ہوا۔ اور یہ ہیں کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں۔

یا کہیں گے نذرانہ ہمیں تنکے کیوں پسند ہیں۔ اور پھر بڑی آپا کے کندھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دس گے۔ اور وہ چلائے گی کیوں میں کیا تکیہ ہوں۔ نہیں نہیں کاؤ تکیہ نہیں میں تو چھوٹے سے تنکے کی بات کر رہا ہوں۔ اور پھر وہ اٹھ بھاگے اور آپا ہانپتی ہوئی پیچھے پیچھے پھر اس روز جب بڑی آپا کا کندھا چھل گیا تھا۔ اور میں ان کے کہنے پر ٹنچر کی پھریری لائی تھی تو بولے۔ ”فیضی یہ

کیا مذاق ہے۔ اس پھریری سے کیا بنے گا۔ مٹی بوتل ہی اٹھا لاتی۔
”بوتل۔ کیوں؟“ میں نے ویسے ہی پوچھا۔ بولے ”اود نہیں سمجھتی یہاں تو
پہاڑ لینا ہے پہاڑ۔ اور بڑی آپا خرائی۔۔۔“

توہ اُس گھر میں قہقہوں کے پٹانے چھوٹتے ہیں ہر وقت اور یہ گھر۔ بس
برف پڑ رہی ہے ہر وقت اور وہ ٹوٹی ہوئی بچکی پھپ پھپ۔ پھپ۔ پھپ۔
اور بس۔ آپا نے منہ موڑ کر دیوار سے پوچھا مٹر گوشت بنا لوں۔ اور وہ کھڑکی
سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔ بنا لو۔ یا انہوں نے صندوق کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا یہ رومال تو بہت میلا ہو گیا ہے۔ اور آپا بولی ”ابھی دھوئے دیتی
ہوں۔“ پر ہزار شور ہو۔ چاہے نجمہ بانو اور بڑھیا کٹھی باتیں کر رہی ہوں۔ لیکن
بھائی نے ہونٹ ہلائے اور آپا کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آپس میں بات کر بھی
لیتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا۔ آپا تو شائد اسی بات پر خوش تھی کہ چلو زبان تو
مٹی بات کرنے کو۔ بولنا تو سیکھ لیا۔ اور آپا۔۔۔ حد کر دی آپا نے تو۔
بھائی نے بات کر دی تو سن لی۔ نہ کی تو نہ سہی۔ ان کے ہونٹوں کی طرف تکتے
رہنا۔ ہائے کیا غلامی ہے۔ آپا تو بس آئی گئی ہو کر رہ گئی تھی۔ آپا کی اس بات
پر یانہ جانے کیوں کٹی بار بھائی جان ٹھٹھک جاتے اور پھر اک بھر پور شکار ڈالتے اس
پر۔ یوں چونک کر دیکھتے اسے گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور آپا مسکراتی۔
چھپی چھپی مسکراہٹ۔ ایسی ایسی باتیں سن کر ہنس دیتی وہ یا جی ہاں کہہ دیتی
جو کوئی اور بیوی سن لے تو قیامت ہی کھڑی کر دے۔ بس ہاں جی۔ جی ہاں۔
اور جی کے سوائے کچھ کہنا ہی نہ جانتی تھی۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے آپا پر۔
اور یوں مسکرائے جاتی جیسے کوئی چشمہ پہاڑی کے اندر ہی اندر راستہ بنا رہا ہو۔
ہائے ری مکار آپا۔

اس روز بھائی جان کسی قدر پریشان تھے۔ میں نے انہیں کبھی یوں یہ قرار
نہ دیکھا تھا۔ کبھی لیٹ جاتے پھر کھبرا کر اٹھ بیٹھتے پھر آپا کے کمرے میں جھانکتے
اور پھر جھینپ کر چلے جاتے یا اندر آتے بھی تو دو ایک ساعت کے لئے اودھ اودھ
دیکھ کر لوٹ جاتے یا چونک کر کہتے ”تم ہو فیضو۔ اچھا۔ اچھا۔“ اور پھر چلے

جاتے۔ آپا بھی تو حیران تھی۔۔۔ آخر شام کے قریب وہ بولے ”صفی کل
مہمان آئیں گے۔ نہیں نہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔
اچھا میں پھر بات کروں گا تم سے۔“ اور وہ چلے گئے۔ آپا نے آنکھیں کھولیں۔
میرا مطلب ہے اس نے شکار بھر کر دیکھا اور مسکرا دی۔ عجیب مسکراہٹ تھی
وہ۔ تعجب خوشی اور غم میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ وہ چلے گئے تو آپا بڑبڑائی۔
”ہوں۔۔۔ میں جانتی تھی کہ ایک ن ایک دن آئیں گے۔ آہی جائیں تو اچھا
ہے۔“ پھر وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی۔ ”تو یہیں بیٹھی ہے فیضو؟“ ”کون آئیں
گے۔“ میں نے آپا سے پوچھا۔ ”ہوں گے نا کوئی۔ تم بھی دیکھ لینا۔“ وہ
مسکرائی۔ میں نے بن جانے بوجھے کہہ دیا۔ ”ہوں تمہاری سہیلی ہوگی کوئی۔“
آپا بہت ہنسی۔ ہنستی ہی گئی۔ توہ ایسا بھی کیا ہے خواہ مخواہ دوسرے کو شرمندہ
کر دینا میں نے کوئی بری بات تو نہ کہی تھی۔ پھر بولی ”ہاں میری ہی تو
ہے۔“ میں چڑ گئی تھی۔ میں نے کہا ”چاہے کوئی ہو تمہاری سہیلی ہو یا ان کی
دوست۔ ہمیں اس سے مطلب؟“ اور آپا پھر ہنسنے لگی۔ کہنے لگی ”میری سہیلی
جو ہوئی سو ان کی بھی تو ہوئی ہوئی کچھ۔“

رات کو بھائی جان نے دو ایک مرتبہ ہمارے کمرے میں جھانکا۔ اس کمرے
میں آپا اور میں سوتے تھے پہلے بانو بھی سویا کرتی تھی یہیں آپا کی چارپائی اور تھے
کے کھٹولے سے پرے اس کونے میں۔ ان دنوں وہ آپا کو دبایا کرتی تھی۔ پھر
آپا نے کہا۔ ”بانو اب میں اچھی ہوں۔ جب ضرورت پڑے گی بلا لیا کروں
گی۔“ بس پھر ہم دونوں رہ گئے یہاں۔ ساتھ ہی بھائی صاحب کا کمرہ تھا۔
دروازہ میرے سرہانے کھلتا تھا۔ بھائی جان نے جو جھانکا تو میں بولی۔ ”بھائی
جان کب آئیں گی وہ مہمان۔“ بھائی جان حیران اور آپا کبھی غصے میں اور کبھی
مسکراتی ہوئی۔ پھر بھائی جان بولے فیضو کو الہام بھی ہونے لگا اب۔ بڑی مشکل
ہو گئی۔ ”میں نے کہا۔ میں کیا جانتی نہیں آپا کی سہیلی آئی۔“ ”تو پھر پوچھ
اپنی آپا سے“ وہ بولے۔ پھر وہ آپا سے بولے۔ ”صفی تمہیں نیند تو نہیں آئے
گی۔“ آپا نے شکار بھر کر دیکھا اور مسکرائی۔ اور وہ بولے۔ ”نہیں اگر تمہیں
نیند آئی ہے تو بے شک سو جاؤ۔ میرا مطلب ہے میں ذرا سا کام کر لوں۔“

اور انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا پھر آپا کی طرف میں سمجھ گئی۔ کہ بس اس بات کی انتظار میں ہیں وہ کہ میں سو جاؤں۔ پھر کیا تھا ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ لگی انگڑائیاں اور جمائیاں لینے اور پھر پتھر سی پڑ گئی جیسے کل کی مری ہوئی تھی سہ تو بہ! ایسے سے کیا مجال کہ ذرا سی بھی ہل جاؤں۔ چاہے لاکھ چیونٹیاں رہنگیں۔ گھجلی ہو۔ اونہوں۔۔۔

بھائی جان نے آکر پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلے سے رضائی میں درز رکھ لی تھی۔ جس میں سے دیکھ بھی سکوں۔ وہ بولے۔ ”فیضو سو گئی۔“ ”فیضو“ آپا نے مجھے آواز دی اور پھر مسکرا دی۔ میں چپ۔ بھائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولے ”یہاں بیٹھ جاؤں میں“ آپا ذرا پرے سرک گئی۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہے۔ میں جانوں وہ گھبرا رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ کیسے شروع کرس بات۔ بات کرنے سے ڈرتے ہوں گے۔ آپا بھی تاڑ گئی۔ اور آپ ہی پھیڑ دی اس نے، بولی ”گب آئیں گے مہمان فیضی کی بات پر نہ جائیں آپ“ ”نہیں نہیں ٹھیک ہے“ وہ بولے۔ ”تم نے سچ کہا تھا۔ وہ کل آ رہی ہے۔ کل رات کو۔ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں گا صفی۔۔۔ نہ جانے وہ کیوں آ رہی ہے“۔ وہ آپ ہی آپ بڑھانے لگے۔ ”کسی گاؤں میں جانا ہے۔ ضروری کام ہو گا۔ کل رات یہاں پہنچے گی۔ پھر صبح سویرے موٹر سے چلی جائے گی اور شام تک لوٹ آئے گی۔ پھر رات یہاں رک کر صبح کی گاڑی سے واپس چلی جائے گی۔ لیکن وہ وریننگ روم میں ٹھہر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں یہاں گھر آ کر ٹھہرنے پر ضد کر رہی ہے۔ اف اس کی ضد۔۔۔!!!“ بھائی نے کہا۔ ”اس کی ضد کون توڑے گا۔ اس کی ضد نے تو کیا کیا توڑ کر رکھ دیا۔ اُسے بھی توڑ دیا۔ لیکن“ وہ غصے میں بڑھائے ”اب آنے کا مطلب۔ یہ میں پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کیوں آ رہی ہے وہ“۔ ”بلکہ اچھا ہوا“۔ آپا بولی۔ ”مجھے تو کب سے ملنے کی آرزو تھی“۔ یہ سن کر بھائی جان حیران رہ گئے۔ ”تم نہیں جانتیں صفی“۔ ”میں جانتی ہوں“۔ وہ بولی ”مجھے معلوم تھا وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ مجھے کتنی خوشی ہوگی“ ”تم“ بھائی جان نے آپا

کی طرف دیکھا۔ جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں آپا کو۔ وہ گھبرائے۔ ”صفی۔ تم جانتی نہیں۔“ ”ہاں ہاں میں جانتی ہوں“ میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا۔ میں تمہیں دھوکا نہ دوں گا صفی“۔ ”میں جانتی ہوں“ آپا بولی۔ اسنے نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ”صفی“ بھائی نے حیرانی سے دیکھا۔ ان کی نگاہ تشکر سے لبریز تھی۔ ”کچھ دن کیلئے یہاں۔۔۔“ وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ آپا بولی۔ ”انہیں روک لیجئے گا“۔ کچھ دیر اکتھے رہیں گے۔ مجھے مدت سے آرزو تھی۔“ ”نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو صفی۔ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں۔

بس وہ تمہاری طرح ہے۔ تمہاری طرح“ بھائی بولے ”میری طرح۔۔۔؟ میری طرح“! آپا کی اس مسکراہٹ میں کیا نہ تھا۔ طنز کی دھار تھی اور چیخ پکار بھی۔ ہائے۔ آپا کی وہ ہنسی۔ میں تو کانپ کانپ گئی۔ ”ہاں“ بھائی بڑھائے۔ ”تمہاری طرح بے داغ۔ اجلی۔ ہم کالج میں اکتھے پڑھا کرتے تھے۔ وہ سب سے الگ تھی۔ باقی لڑکیاں تو چاؤ چونچلے کرنے میں لگی رہتیں۔ لیکن نیلی اس کا نام ہے عیسائی ہے نا وہ۔ میں اسے نیلی کہا کرتا ہوں۔ نیلی“۔ بھائی مسکرائے۔ ”معا“ آپا نے شہ کی طرف دیکھا۔ ”نیلی کسی سے نہ ملتی تھی اس میں اک آن تھی۔“ بھائی نے پھر بڑھانا شروع کر دیا۔ ”مجھے اس کی یہی بات بھاگنی۔ ہم اکثر اکتھے بیٹھے رہتے۔ میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ گھنٹوں اکتھے بیٹھے رہتے لیکن کیا مجال جو کوئی حرکت ہو۔ فضول بات۔۔۔ میرا مطلب ہے“۔ ”میں سمجھتی ہوں“۔ آپا نے کہا۔ بھائی ہنسنے لگے۔ ”ایک دفعہ میں نے کچھ کہہ دیا تھا۔ ویسے ہی مذاق میں اُف کس قدر بگڑی۔ بولی۔ مسٹر جلیل۔ میرے خیال میں آپ یہاں آ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔۔۔ ہفتہ بھر تک اس کا غصہ نہ گیا۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پیغام دے دیا۔ شادی کرنے میں تو اسے اعتراض نہ تھا۔ لیکن بڑی کڑی شرط تھی اس کی۔ کہنے لگی۔ ”مسٹر جلیل“ ”پرہیز“ دینے سے پہلے یہ جان لیجئے کہ میں شادی اپنے ہم مذہب ہی سے کروں گی۔۔۔ میں اس کے لئے وہ کام بھی کر سکتا تھا جو کسی کے لئے کرتے کو تیار نہ ہوتا۔ لیکن مذہب بدلنا! یہ مجھے

گوارا نہ تھا۔ ہزار منتیں کیں۔ کہا ”نیلی تم میری ہی نہیں اپنی زندگی بھی برباد کرو گی“۔ پر۔۔۔ اس کی بات اٹل تھی۔ کہنے لگی ”میں جانتی ہوں۔ اس سے زیادہ جانتی ہوں۔ شائد۔ شائد میں کبھی کسی سے پیار نہ کر سکوں۔ لیکن مسٹر جلیل محبت ابھی لپچہ نہیں ہے اس دنیا میں۔ محبت ایک بہت بڑا جذبہ ہے۔

لیکن اس کائنات میں اس سے بڑے بڑے جہاں بھی ہیں۔

چھ مہینے کے بعد جب میں پھر اس سے ملا تو کہنے لگی۔ ”بہتر ہے کہ اب یہ چنگاری یا تو بجھ جائے یا بجسم کر ڈالے۔ اب بار بار مل کر اسے بزدلانا اچھا نہیں۔ ان دنوں وہ کس قدر لاغر ہو رہی تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی اسے وق نہ ہوا تو کہنا۔ لیکن اپنی ضد کی ہکی ہے۔ یہ بات اس نے سن لی۔ کہنے لگی۔ ”اماں۔ وق نہ بھی ہو تو کیا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا۔۔۔ بس ایک ہی افسوس ہے مجھے۔ صرف ایک بچہ۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں ”بھائی نے بہانے بہانے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ توہ میں تو بھائی کی حالت دیکھ کر سن ہو رہی تھی۔ نہ جانے لوگوں کو آپ جلنے اور کسی کو جلانے میں کیوں مزہ آتا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا بھائی اس قدر دکھی ہیں۔“ نہ جانے اب وہ کیوں آ رہی ہے۔“ بھائی اٹھ بیٹھے۔ ”ضد۔ اور کیا۔ لیکن صفی۔ یہ نہ بھولنا کہ اب۔ اب بے سود ہے۔ اب میں تمہارا ہوں۔ صرف تمہارا۔ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں آ سکتا۔“

بڑی اماں نے سنا تو پھپھہ پھپھہ کر کے بولی۔ ”نہ جی میں نہیں جانتی سہیلی وہیلی۔ توہ۔۔۔ کیا زمانہ آیا ہے“ ”یہ ویسے ہی چھیڑ رہے ہیں سہیلی تو میری ہے۔“ آپا بولی ”چاہے کسی کی ہو۔“ بڑی اماں بولی۔ ”پر ہے تو کافر میں تو کسی کافر کو منہ نہ لگنے دوں گی بچہ زچہ کے۔ نہ بھٹی۔ یہ شگن اچھا نہیں ہوتا۔“

اس روز میں نے دوپہر کو جی بھر کر سو لیا۔ جانتی تھی ناکہ رات کو وہ آنے والی ہے۔ ہائے کس قدر چاڑ تھا مجھے اسے دیکھنے کا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ دیکھوں تو کیسی ہے۔ بڑی پھبن ہو گی۔ کالج کی جو ہوئی، ہائے میری تو جان

جاتی ہے ان کالج والیوں پر۔ کس طرح بات کرتی ہیں۔ جیسے شربت کے گھونٹ پی رہی ہوں اور پھر ان کا چلنا پھرنا۔ ہر بات میں لے ہوتی ہے لے اور رنگ !! رنگوں کے چٹاؤ میں تو صد کر دیتی ہیں۔ مجھے تو ان کالج والیوں سے عشق ہے عشق۔

اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ وہاں اس سنگم کی چارپائی ڈلوا دی اور اپنی چارپائی ہمارے کمرے میں لے آئے۔

توہ کتنا انتظار کرنا پڑا مجھے۔ بھائی تو اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ اور آپا کروٹیں لے رہی تھی۔ جیسے کسی پہلو قرار نہ ہو۔۔۔ نہ جانے کیا وقت تھا جب وہ آئے۔ اور میرا دل لٹکا دھک دھک کرنے۔ میں نے رضائی میں سے دیکھا۔ پر۔ اسی جگہ پر تھی میری چارپائی کہ وہ نظر نہ آئی۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی۔ لیکن ہلتی کیسے۔ میں تو کب کی یوں پڑی تھی۔ جیسے نیند میں بیہوش ہو کوئی۔ ہلتی تو آپا کو پتہ چل جاتا۔۔۔ اُدھر اُن دونوں کا جھگڑا شروع تھا۔ ہائے کیسی پیاری آواز تھی۔ کیسا لوج تھا۔ یوں گول گول لفظ نکلتے تھے منہ سے جیسے رس نکلے ہوں۔ پر تھی وہ اس طرف دیوار کی اوٹ میں اور سامنے بھائی جان کرسی پر بیٹھے تھے۔

وہ بچے کو دیکھنے کی ضد کر رہی تھی اور بھائی جان کہہ رہے تھے۔ ”اگر کچھ ہو گیا اسے تو سب سمجھیں گے کہ بس تم ہی کچھ کر گئی ہو“ وہ بھائی جان کی باتوں کو مانتی تو تھی پر میں جانوں اسے آپا اور تھے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ توہ! اس قدر دبی دبی باتیں کر رہے تھے وہ کہ سنی نہ جاتیں۔ کبھی کوئی لفظ کان میں پڑ جاتا۔ آپا بھی تو بار بار کان سے بال ہٹاتی تھی۔ گو دیکھنے میں چپ پڑی تھی وہ یوں کھوئی ہوئی تھی کہ تھے کو تھپکنا بھی بھول گئی تھی۔

”ہاں۔ اس کی آواز آئی۔“ ”اب میں نے جان لیا ہے۔“ اس نے اک آہ بھری۔ ”اس بات میں مذہب کو لانا یہ میری بھول تھی۔ لیکن۔۔۔“ ”نہیں نہیں“ بھائی جان تڑپ کر بولے۔ ”اب۔ اب اس بات کو۔“

”ہاں۔ اب! وہ ہنسی۔ دھار سی تیز ہنسی۔ گویا وہ دھار اپنے آپ کو کاٹ رہی ہو۔“

”یہ تم نے کیا کیا“ بھائی اٹھ بیٹھے۔ ”اگر اب جان بھی لیا تھا تو کہنے سے فائدہ۔ اوہ۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا نیلی۔ پھر سے مجھے۔۔۔“

”پھر سے“ وہ ہنسی۔ ”ہاں۔ آپ کے لئے تو پھر سے ہے۔۔۔ لیکن یہاں جب اب سب ایک تار سے بندے ہیں۔ پھر تو ہوا ہی نہیں۔“

”نیلی“ بھائی چلائے۔ ”تم اب آرام کرو۔ تھکی ہوئی ہو۔“

”ہاں۔ پُور ہوں پُور۔۔۔ لیکن میں مسز جلیل سے ضرور ملوں گی چاہے کچھ ہو۔ میں آپ اندر چلی جاؤں گی۔“

”نہیں نہیں آج نہیں۔“ بھائی بولے ”اگر صفی کو اعتراض نہ ہوا تو کل بڑی اماں سے چوری۔۔۔“

”اور پچہ۔ وہ تو مجھے دے دیکھئے۔ وہ میرا ہے۔ مسٹر جلیل!“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ بھائی بولے۔

”آخر میں کیسے گزار سکوں گی۔“

”لیکن۔ وہ نہ مانے گی۔“

”میں منالوں گی اُسے۔“

بھائی جان گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

صبح جب میں جاگی تو مہمان جاچکی تھی۔ بھائی جان اسے پہلی موٹر میں بٹھا آئے تھے۔

سارا دن میں دعائیں مانگتی رہی کہ بھائی جان اسے آپا سے ملانے پر راضی ہو جائیں۔ وہ آپا سے نہ ملتی تو میں اسے کیسے دیکھتی اور اسے دیکھنے کے لئے ٹرپ رہی تھی میں۔

شام کو میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپا بگڑی بیٹھی ہے۔ غصے میں

کہہ رہی تھی ”میں ضرور ملوں گی۔ چاہے آپ مانیں نہ مانیں میں آپ ادھر چلی جاؤں گی۔“ بھائی جان نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا اور آپا کو چپ کرا دیا۔ میں بھی وہاں سے سرک گئی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن بھائی جان کی میز کے پیچھے بیٹھ کر سننے لگی۔ وہ مجھے میں باہر چلی گئی ہوں۔

آپا پھر چمک کر بولی۔ اف۔ آپا۔ اس روز آپا لڑ رہی تھی۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔ آپا اور بھائی جان سے لڑے۔ وہ آپا جو جی ہاں کے سوا کچھ کہنا جاتی نہ تھی بولی ”اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ آخر لوگ چار چار کرتے ہیں۔ میں اس کی خدمت کروں گی۔ ایمان سے مجھے کوئی کلمہ نہ ہو گا۔“

”لیکن کیوں“ بھائی نے بات کاٹ دی۔

”بس میرا جی کہتا ہے۔“ آپا بولی۔ ”ایسی اچھی ہے وہ۔ اس کی زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں آپ۔“

”لیکن تمہاری زندگی“ بھائی بولے۔

”میری زندگی“ آپا نے دہرایا۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ بچتا ہے۔ ”میری زندگی کو جانے دیکھئے۔ کئی آئی چیز کا کیا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ بھائی غصے میں اٹھ بیٹھے ”یہ نہیں ہو سکتا اب تم اور مجھ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپا کا چہرہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ جسے کوئی بیماری کے بعد سکھ کی نیند سو جاتا ہے۔ آپ ہی آپ مسکراتی تھی۔ ایسی جیسے نیا نیا سہاگ ملا ہو۔

شام کو نیلی لوٹ آئی۔ ہم سب اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب بڑی اماں عشاء کی نماز شروع کرے اور نیلی ہم سے ملے۔ چونکہ بھائی جان نے کہہ دیا تھا کہ اماں نماز شروع کرے گی تو ملا دس گے تم سے! اماں کی نماز بھی تو ایسی ویسی نہ تھی۔ نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی وہ۔ نماز ختم ہوتی تو کھڑی ہو کر کچھ پڑھتی۔ پھر بیٹھ کر ہونٹ ہلاتی رہتی اور پھر ایک لمبا سجدہ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے سجدے میں ہی دم نکل گیا ہو۔ تو یہ اس روز وقت تھا کہ رک گیا تھا۔۔۔ نہ جانے

”کام ہے ایک“ قاسم کی محالیں کوتلوں میں چھپنے کی کوشش کرتی۔
 ”کوئی نہیں کام وام پھر کر لینا“۔ لیکن وہ چلا جاتا جیسے کوئی جائے پر مجبور ہو اور وہ آپ ہی آپ میٹھی مسکاتی رہتی۔

اس روز جب وہ جانے لگا تو وہ مشین چلاتے ہوئے بولی۔ ”قاسمی ڈرا یہاں
تو آنا“ ----- ایک بات پوچھوں بتاؤ گے۔ ”کیا ہے“ وہ رک گیا۔ ”یہاں
آؤ بیٹھے جاؤ۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی۔ وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ
گیا۔ وہ زبرد لب مسکرائی۔ پھر دفعتاً اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کے
سر کو اپنی رانوں پر رکھ کر تھپکنے لگی۔ ”سچی سچی بتانا قاسمی“۔ دو ایک مرتبہ قاسم
نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن نشتے کی ریشمیں نرمی۔ خس کی ہلکی ہلکی
خوشبو اور جسم کی مدہم مخملی گرمی ----- اس کی قوت حرکت شل ہو
گئی۔ ”تم میری طرف اس طرح کیوں کھورتے رہتے ہو۔ ہوں؟“ اس نے ایک
پیاد بھرا تھیڑ مار کر کہا۔ بتاؤ بھی ----- ہوں“۔ قاسم نے پورا زور
لگا کر سر اٹھا لیا۔ وہ انجانے جذبات کی شدت سے بہوت بنا ہوا تھا۔ آنکھیں
اکارہ ہو رہی تھیں منہ نبات کی طرح سُرخ اور سانس پھولا ہوا تھا۔ ”ہیں! یہ
تمہیں کیا ہوا؟“ وہ منہ پکا کر کے پوچھنے لگی۔ ”کچھ بھی نہیں“ قاسم نے منہ موڑ
کر کہا۔ ”خفا ہو گئے ہو کیا؟“ اس نے از سر نو مشین چلاتے ہوئے پوچھا اور
دوپٹہ منہ میں ڈال کر ہنسی روکنے لگی۔ ”نہیں نہیں کچھ بھی نہیں“۔ وہ بولا
”اچھا اب میں جاتا ہوں“۔ اور باہر نکل گیا۔

اس کے بعد جب وہ اکیلے ہوتے قاسم اٹھ بیٹھتا۔ ”اچھا اب میں جان ہوں۔ لیکن اس کے باوجود منہ موڑ کر کھڑا رہتا اور وہ مسکراہٹ بھینچ کر کہتی۔ ”اچھا۔ ایک بات تو سنو“۔ اور وہ معصوم انداز سے پوچھتا۔ ”کیا بات ہے“۔ یہاں آؤ۔ بیٹھ جاؤ وہ منہ پکا کر کے کہتی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اور بھی معصومانہ انداز سے پوچھتا۔ ”کیا ہے“ معاً حنائی ہاتھ حرکت میں آ جاتے اور قاسم کا سر غمیلی، معطر تکیہ پر جا ٹکتا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھکنے لگتے۔ اس کے تن بدن میں پھلجیریاں چلنے لگتیں۔ نسون میں دھنکی بجنے لگتی۔ آنکھوں

جپ

“ ”

جیناں نے چچی کی نظر پچا ماتھے پر پیاری تیوری چڑھا کر قاسم کو گھورا ۔ اور پھر نٹے کی شلوار کے اٹھائے ہوئے پاتے کو مسکرا کر نیچے کھینچ لیا اور ازسرنو چچی سے باتوں میں مصروف ہو گئی ۔ قاسم چونک کر شرمندہ سا ہو گیا اور پھر معصومانہ انداز سے چارپائی پر پڑے ہوئے رومال پر کاڑھی ہوئی سیل کو غور سے دیکھنے لگا ۔ اس کا دل خواہ مخواہ دھک دھک کر رہا تھا ۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا ۔ گویا اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو ۔ قاسم کئی بار یوں چوری چوری جیناں کے جسم کی طرف دیکھتا ہوا پکڑا جا چکا تھا ۔ جیناں کے مسکرا دینے کے باوجود وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کی ٹکلیں چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتیں ۔ نہ جانے کیوں یوں ان جانے میں اس کی نظر جیناں کے جسم کے بیچ و خم یا ابھار پر جا پڑتی ۔ اور وہیں گڑ جاتی ۔ اس وقت وہ قطعی بھول جاتا کہ کدھر دیکھ رہا ہے یا کچھ دیکھ رہا ہے مصیبت یہ تھی کہ بت تبھی وقوع میں آتی جب جیناں کے پاس کوئی نہ کوئی ہمسائی میٹھی ہوتی ۔ پھر جب جیناں اکیلی رہ جاتی تو وہ مسکرا کر پوچھتی ۔ ”کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی“ ؟ میں ”میں نہیں تو“ وہ گہرا جاتا اور جیناں ہنستی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی ۔ ”کسی کے سامنے یوں پاگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے بلو“ ۔ اگرچہ اکیلے میں بھی جیناں کا پاتچہ اکثر اوپر اٹھ جاتا اور دوپٹہ بار بار چھاتی سے یوں نیچے ڈھلک جاتا کہ ساٹھل میں ملبوس ابھار نمایاں ہو جاتے ۔ لیکن اس وقت قاسم کو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی حالانکہ جیناں بظاہر شدت سے کام میں منہمک ہوتی ۔ لیکن قاسم یہ قرار ہو کر اٹھ بیٹھتا ۔ اب میں جاتا ہوں ۔ وہ نظر اٹھاتی اور پھر لاڈ بھری تیوری چڑھا کر کہتی ۔ ”بیٹھو بھی ۔ جاؤ گے کہاں“ ۔

اس رات محلے بھر کی آوانس گلی میں آکر گونجتیں اور پھر قاسم کے دل میں دھک دھک بھتیں عجیب سی ڈراؤنی آوانس اس رات وہ آوانس - ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل میں پہاڑی نالے کی طرح بہ رہی تھیں - بچے جا رہی تھیں - محلہ ان آوازوں کی مدد سے اس سے انتقام لے رہا تھا - بچے کھیل رہے تھے ، ان کا کھیل اسے برا لگ رہا تھا - نہ جانے مائیں اتنی دیر بچوں کو باہر رہنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں - پھر آہستہ آہستہ ان کی آوانس مدہم ہوتی گئیں - پھر دور محلہ کی مسجد میں ملا کی اذان گونجی - ایسا معلوم ہوتا تھا - جیسے کوئی چیخیں مار مار کر رو رہا ہو - کس قدر اداس آواز تھی جسے وہ بھیانک تر بنا رہا تھا - ایک ساعت کے لئے خاموشی چھا گئی - کراہتی ہوئی خاموشی - دروازے کھل رہے تھے یا بند ہو رہے تھے - اف کس قدر شور مچا رہے تھے وہ دروازے کو یا رینگ رینگ کر شکایت کر رہے ہوں -

”ٹن ٹن ----- بارہ ----- اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سنا۔ لیکن آواز اس تھیں کہ تختی ہی نہ تھیں۔ کبھی کوئی بچہ بلبلا اٹھتا۔ اور ماں لوری دینا شروع کر دیتی۔ کبھی کوئی بڑھا کھانس کھانس کر محلے بھر کو ازسرنو جکا دیتا۔ نہ جانے وہ سب یونہی بیدار رہنے کے عادی تھے، یا اسی رات حالات بگڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے میں اماں کی کردٹوں سے چارپائی چنچ رہی تھی۔ اماں کیوں یوں کروٹیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اس کا بھید جانتی نہ ہو کہیں۔ چلنے لگے تو اٹھ کر ہاتھ نہ پکڑ لے اماں اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ شاید جیناں نہ آئے اور وہ مضطرب ہو جاتا۔ اف وہ کتے کیسی بھیانک آواز میں رو رہے تھے۔

شاید اس لئے کہ وہ جیناں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا۔ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ اور وہ حنائی ہاتھ پیار سے اسے ٹھپکتا رہا۔ اور وہ آواز اس کو نجاتی ملیں یا شاید اس لئے کہ وہ سارا سارا دن آپیں بھرتا۔ کروٹیں بدلتا۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا رات کو عیمدہ کمرے میں سونے پر ضد کرتا اور پھر جیناں ڈی ایم سی کا گولا منگوانے آتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ آنکھیں جھومتیں اور وہ بھول جاتا کہ اماں کے پاس مجھے والیاں میٹھی ہیں۔ یا ویسے ہی جیناں کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جیناں کے میاں روز بروز بیوی سے جھگڑا کرنے لگے تھے۔ حالانکہ جیناں بظاہر ان کا استہارہ رکھاؤ کرتی تھی پھر ان دنوں تو وہ اور بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگی تھی۔ مگر میاں کو نہ جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا۔ گویا وہ توجہ صرف دکھلاوا تھی اور وہ روز بروز ان سے بے پروا ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے

جب کبھی کسی وجہ سے بینچک کی تیسری کھڑکی نہ کھلتی تو معاً اسے خیال آتا کہ وہ اپنے میاں کے پہلو میں پڑی ہے اور وہ معطر گود کسی اور کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ حنا آلود ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اس خیال سے اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر رات کاٹ دیتا۔ پھر جب کبھی وہ ملتے تو

پتھر یہ باتیں مدہم پڑتی گئیں ، مدہم تر ہو گئیں ۔ حتیٰ کہ بات عام ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔ غالباً لوگوں نے اسے ایک کھماراز تسلیم کر لیا ۔ اور ان کے لئے مزید تحقیق میں دلچسپی نہ رہی نہ جانے جیناں کس مٹی سے بنی تھی اس کی ہر بات نرالی تھی ۔ جوں جوں لوگ اسے مشکوک محابوں سے دیکھتے گئے ۔ اس کی مسکراہٹیں اور بھی رواں ہوتی گئیں ۔ حتیٰ کہ وہ محلے والیوں سے اور بھی ہنس ہنس کر ملنے لگی ۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہی اس کی پیٹھ پیچھے باتیں کرتی

کئی مرتبہ دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ شک سانپ کی طرح ڈسنے لگتا کہ دونوں بیٹھے ہیں۔ وہ اور مومن اور اس کا سر ریشمیں تکتے پر ٹکا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا اور واپسی پر جیناں کو ڈھونڈتا تو دیکھتا کہ جیناں یوں مگن بیٹھی ہے۔ گویا پرانے خواب دیکھ رہی ہو۔ کسی رنگین ماضی کے دھیان میں مگن ہو یا شاید کسی متوقع مستقبل کے۔ وہ چپ ہو جاتا۔ اسے یوں دیکھ کر جیناں مسکرا کر کہتی ”کیا ہے آج سرکار کو؟“ اور وہ مسکرانے کی کوشش کرتا۔ ”ہماری جیناں کھو گئی اب کیا ہو گا؟“ اور وہ ہنسنے لگتی ”پائی ہوئی چیز کو کھونے کا بہت شوق ہے سرکار کو؟ پائی ہوئی“ وہ ہنستا۔ جسے رنگین خواب میسر ہوں وہ بھلا تلخ حقیقت کو کیوں دیکھے۔ اسے جاگنے کی کیا ضرورت۔ جاگ کر دکھتا ہی کیا ہے بس چپ چپ سنائی دیتا ہے۔ ان دنوں تو ”چپ“ میں بہت مزہ تھا۔ اب ہماری چپ بھی پسند نہیں۔ اور وہ چڑ کر جواب دیتی ”کہاں وہ ”چپ““

کسی نے کہا - ”اے بے جیناں کیا اے گود میں کھلائے گی - میاں نہ ہوا - لے پالک ہوا“ - چاچی ہنسی ، بولی ”تو چھوڑ اس بات کو بی بی - آج کل کے لڑکوں کو گود میں پڑے رہنے کا چسکا پڑا ہوا ہے - جو رو کو ماں بنا لیتے ہیں ،

پھر چرچا ہونے لگا۔ محلے والیاں بڑے اشتیاق سے دلہن کو دیکھنے لگیں۔ اگرچہ ان کی مبارکباد طعنہ آمیز تھی۔ لیکن آخر مومن کی ماں کو مبارک تو دینا ہی تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ جب مومن اور جیناں محلے میں داخل ہوئے۔ عین اس وقت قاسم گلی میں کھڑا چاچی سے بات کر رہا تھا۔ اس روز وہ ایک سرکاری کام پر ایک دن کیلئے باہر جا رہا تھا اور چاچی سے کہہ رہا تھا۔ ”ہاں چاچی سرکاری کام ہے کل رات کی گاڑی سے لوٹ آؤں گا۔“ چچے آہٹ سن کر وہ مڑا تو کبکھڑا ہوا۔ جیناں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ بھکا۔ حتیٰ کہ اسٹیشن پر جا کر دم لیا۔

اس روز دن بھر وہ جیناں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ دل میں ایک اضطراب سا کھول رہا تھا۔ مگر وہ تیزی سے کام میں مصروف رہا۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لینے کے لئے بے تاب ہو۔ کام ختم کر کے وہ رات کو گاڑی پر سوار ہو ہی گیا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ اس گہما گہمی میں وہ قطعی بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ کہاں جا رہا ہے اور وہاں کون آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ محلے کے پاس پہنچا تو ایک بجنے کی آواز آئی ”ٹن“ معا وہ دبے پاؤں چلنے لگا۔ گویا ہر آہٹ اس کی دشمن ہو۔ گلی میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ وہی پرانا قاسم تھا۔ دفعتاً ایک ریشمیں معطر گود اس کی نگاہ تلے جھلملائی۔ دیکھوں تو بھلا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا دل دھڑکنے لگا۔ بھگدھڑک کی تیسری کھڑکی پر جا کر ٹکی۔ اٹکی سے دبایا تو پٹ کھل گیا۔ اور وہ اندر چھا گیا۔ معا سامنے سے اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ وہ گھبرا کر مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ روشنی ایک حسین چہرے پر جا پڑی۔ ”ہاں وہی“ سیریلیوں میں جیناں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”تم؟“ وہ غصے سے چلایا۔ ایک ساعت میں اسے سب باتیں یاد آچکی تھیں۔ اس کا جسم نفرت سے کھولنے لگا تھا۔ ”چپ“ جیناں نے منہ پر ہتھی رکھ لی۔ قاسم کا جی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو نوچ لے۔ وہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آئے۔ لیکن اچانک حنائی ہاتھ بڑھا۔ ”میں جاتی تھی تم آؤ گے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔“ قاسم کا سر ایک رنگین معطر گود پر جا ٹکا۔ جس کی مدہم گرمی حنائی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اسے تھکنے لگی۔ قاسم نے ایک دو مرتبہ جوش

اس واقعہ پر قاسم کی زندگی نے ایک بار پھر ہلکا کھلایا۔ اسے عورت سے نفرت ہو گئی۔ محبت پر اعتبار نہ رہا ”عورت؟“ وہ دانت پیس کر کہتا ”عورت کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔ ناگن صرف ڈسنا جاتی ہے صرف ڈسنا! اگر اس نے طلاق لکھ بیچی تھی۔ تو صرف اس لئے کہ محلہ کے لوگ اسے مستفسرانہ محابوں سے دیکھتے تھے۔ اور عورتیں صبح و شام اس کی باتیں کرتیں تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے اور اپنی زندگی از سر نو شروع کرے۔ لیکن جب اس نے سنا کہ جیناں نے مومن سے نکاح کر لیا ہے۔ تو وہ اس بظاہر بے تعلقی کے باوجود جو وہ جیناں کے متعلق محسوس کرنا چاہتا تھا۔ ٹرپ کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ ہر وقت جیناں سے نفرت پیدا کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اسے برا بھلا کہتا۔ بے وفا فاحشہ سمجھتا۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں تلے ریشمیں معطر گوو آکر کھل جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہیں سر ٹکا دے۔ وہ سنائی باتھ اسے تھپکے اور وہ تمام کچھ بھول جائے پھر کسی وقت اس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آکھڑا ہوتا۔ وہ ہونٹ کہتے ”چپ“ اگرچہ اس وقت وہ لاجول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا تھا۔ لیکن یہ تصاویر اسے اور بھی پریشان کر دیتیں اور وہ اور بھی کھو جاتا ایک سال کے بعد جب جیناں اور مومن محلے میں آئے تو

پُل

آپ پُل کو نہیں جانتے ۔ بھلا جانتیں بھی کیسے جب کہ نہ تو وہاں کوئی شہر آباد ہے ۔ اور نہ ہی کوئی گاؤں ۔ بس دریا پر اک عام سا پُل بندھا ہے ۔ جس پر ریل کی لائن نکچی ہے جو سرحدی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی ہے ۔ وہ ایک عام سا پُل ہے ۔ ایک ایسے غیر معروف سے دریا پر جو دیکھنے میں نالا منظر آتا ہے ۔ البتہ اگر غور سے دیکھیں تو پانی کا بہاؤ اتھاہ گہرائی کا غماز ہے ۔ لیکن غور سے دیکھنے کی فرصت بھی ہو ۔ جب تک آپ گاڑی کی کھڑکی سے سر نکالتے ہیں گاڑی پُل کے پار جا چکی ہوتی ہے ۔

اول تو کوئی پُل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا ۔ دیکھ بھی پائے تو یہ راز نہیں کھلتا کہ پُل ایک ریلوے سٹیشن ہے ۔ سٹیشن کے آثار ہی غائب ہیں ۔ نہ آہنی جنگلہ نہ پلیٹ فارم ۔ نہ وہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہے اور نہ کوئی اترتا ہے ۔ باتوں کے باوجود ایک اہم سٹیشن ہے ۔ یہ اہمیت سیاسی نوعیت کی ہے ۔ وہ دو حدود کا ”سنکھم“ ہے ۔ گاڑی رکتی ضرور ہے چاہے رکتے ہی چل دے ۔ گاڑی وہاں یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آپ محسوس تک نہیں کرتے ۔ بفرض محل آپ محسوس بھی کر لیں تو آپ سمجھیں گے ۔ گاڑی محض رک گئی ہے کھڑی نہیں ہوئی ۔ نہ جانے کیوں ۔ کوئی بات ہو گئی ہے ۔ اور پھر آپ زیادہ ضروری امور کے متعلق سوچنے لگتے ہیں ۔ میرا مطلب ہے وہ امور جنہیں آپ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں ۔

مصیبت یہ ہے کہ سٹیشن ایک بڑے جنکشن کے قریب ہے ۔ اس قدر قریب کہ آپ کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایک سٹیشن دوسرے سٹیشن سے اس قدر قریب ہو سکتا ہے ۔ جنکشن کی افراتفری کے بعد جب گاڑی چلتی ہے ۔ تو آپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جگہ بنانے یا نہ جانے کب تک کھڑے رہنے کا تہیہ

میں آکر اٹھنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ خوشبو ریشمیں بدن ، مدہم گرمی اور حنائی ہاتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا غصہ ، آتسو بن کر بہہ گیا ۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ حنائی ہاتھ اور خوشبو اسے تھپک رہے تھے ”چپ“ جیناں منہ پر اٹھکی رکھے مسکرا رہی تھی !

منزل گزر رہی ہے۔ گزر چکی ہے یا وہ غیر علاقہ میں داخل ہونے والے ہیں۔
التیہ نائب کھڑا حیرانی سے برجیس کو دیکھ رہا تھا۔

”کھانا“ سعیدہ چلائی۔ ”روتی ہو تم“۔

”اوں ہوں“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”پھر یہ آنچلیوں“۔ سعیدہ نے اس کی کال پر اٹھ لی کہہ کر کہا۔

ہرج نے پیدا سے سعیدہ کی اچھی چوم لی ۔

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔“

“~~~~~”

اندروں سے آواز نہیں سنائی دیتی۔ - سرج کے کان میں ٹیلا آویزا اور بھی لہڑے لگا۔

”اوس آنچھو میں“ سعیدہ مستلا کر بولی۔

”کہاں ہیں“

”گھوڑی کے ہیں؟“ سعید نے پوچھا۔

ہرج سرہلا کر مسکرا دی ۔

آہا۔ ”کھاڑی“۔۔۔۔۔۔ سعیدہ کھاڑی کو آتا دیکھ کر چلائی

برج نے اسے اٹھا لیا اور دروازہ میں جا کھڑی ہوئی۔ اس وقت اسے قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ دروازہ کی چابک لپٹی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔۔۔۔۔ اور بجائے کہاں دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔

"آمی۔۔۔۔۔ یاہو" سعید نائب کو آتے دیکھ کر چلائی ۔ لیکن برج نے اس کی بات نہ سنی ۔

کاڑی میں مسافر منزل کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ پُل ایک سٹیشن ہے۔ ایک اہم سٹیشن جو دو سرحدوں کو ملاتا ہے۔ بلکہ وہ سٹیشن کے وجود ہی سے منکر تھے۔ اور انہیں پتہ نہ تھا۔ کہ ایک اہم

احسان علی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی۔ احسان علی کی۔ محلے میں کون تھا۔ جوان کی باتوں سے محفوظ نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے۔ جہاں بوڑھوں کی محفل لگی ہوتی۔ تو کھانسی کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے۔ چوکان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا۔ محلے کے کنوئیں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی۔

جوان لڑکیاں انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں۔ مثیاد عورتیں دیکھ پاتیں تو ان کے کالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ خواہ مخواہ جی چاہتا ہے کہ کوئی بات کہیں۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔

مثلاً اس روز احسان علی کو چوکان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی۔ ”ہاں کھڑے کسے تاڑ رہے ہو احسان علی؟“

”یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ جو لگا ہے۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو۔“ بھابی کہنے لگی۔ ”اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔“

”اور تو کیا اپنے لیے دیکھ رہا ہوں بھابی“ احسان علی مسکرایا۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ احسان ہنس کر بولا۔ ”دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی چاچی اپنے لئے دیکھوں تو لوگ گھورتے ہیں کسی اور کے لئے دیکھوں تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں۔“

جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا۔ ایسا جواب دیتے کہ سنکر مڑا آ جاتا۔

شاداں نے یہ سنکر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”چاچی اس عمر میں اوروں کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا۔“

احسان علی نے آہ بھری۔ بولے۔ ”کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں۔“

”اتنی عمر ہو چکی ہے چچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی۔“ شاداں مسکرائی۔ ”ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں ہٹی۔“

”اچھا شاداں ایمان سے کہنا۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔ ”کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے۔؟“

”ہائیں چچا۔“ شاداں ہونٹ پر اٹھکی رکھ کر بیٹھ گئی۔ ”میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ ہنسے۔ ”جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں۔ لیکن جب جوان تھی تو بے جی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھی کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں؟“

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے۔

ان کے جانے کے بعد بھابی نے کہا۔ ”توبہ بہن، احسان علی اور بات کرنے سے چو کے۔“

چاچی بولی۔ ”ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی۔ اب تو باتیں ہی باتیں ہیں۔“

”لے بہن“ شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب کوٹسا حاجی بن گیا ہے اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے۔“

”لیکن شاداں“ بھابی نے کہا۔ ”شباباش ہے۔ اس کو۔ کبھی محلے کی لڑکی کو میلی نظر سے نہیں دیکھا۔“

”یہ تو میں مانتی ہوں۔“ شاداں نے ان جانے میں آہ بھری۔

”یہ وصف بھی کسی کسی میں ہوتا ہے۔“ چاچی نے کہا۔

جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سنی تھی تو بولے۔
”استما بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں“

”کیوں؟“ چاچی نے ہنس کر کہا۔ ”یہ کیا جھوٹ ہے۔ تمہاری یہ بات واقعی خوب ہے۔ میں تو منہ پر کہوں گی احسان علی۔“

”لو چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارا محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا۔“
احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ”چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلی کنوئیں میں گر گئی۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر بولی بہن آج کی رات یہیں بسر کریں گے۔“

”یہ بلی کا قصہ کیا ہوا۔“ چاچی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔“ شاداں بولی۔

”بس تو چھوڑ اس بات کو۔“ بھابی نے کہا۔ ”احسان علی کی بات کریدنے سے نکلے گا کیا؟“

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے۔ ”چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے بیچاری ایسی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں؟“

”ہائے اللہ۔ سنا تم نے چاچی؟“ شاداں چلائی۔

”سمجھی بھی ہو اس کی بات؟“ بھابی مسکرائی۔

”سب سمجھتی ہوں۔“ چاچی نے ہنس کر کہا۔

”خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔“ شاداں بولی کہ محلے والیاں ایسی ہیں ہر میں پوچھتی ہوں۔ چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی رنجہ جالتے اس پر؟“

”تم اس کی باتیں سنو۔“ بھابی نے کہا۔

”توہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے“ چاچی ہنسی۔

”کسی محلے والی پر رنجہ تو اک بار مڑا چکھا دیتی تمہیں چچا۔“ شاداں آنکھیں چمکا کر بولی۔ ”جو تا دکھا دیتی میاں کو۔ کیوں بھابی؟“

”واہ“ احسان علی مسکرائے۔ ”شاداں جس نے جو تا دکھا دیا سمجھو بات ہکی کر دی۔“

”ہائے میں مر گئی۔“ شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

”احسان علی تم پر خدا کی سنوار“ چاچی نے ہاتھ چلایا۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے۔ ان کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گذشتہ زندگی پر ناک بھون پڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی۔ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں۔ جوان میٹلڈس تو اب بھی پلا پچا کر نکلنے کی کوشش کر رہیں۔

جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی۔ ”ہائے میں مر گئی۔“ یہ تو اپنا احسان علی ہے۔ ”ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی اسے مخدوش ٹکاپوں سے کھورتی تھیں۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری پڑھالیتے۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے۔ اور یوں ہمکلام ہوتے جیسے فراخ دل کیوجہ سے ان کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں اکثر کہا کرتے۔ ”بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے۔ جنہیں نہ ہو انہیں کبھی نہیں ہوتی“

”حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے۔ باباجی۔“

”ہاں بھئی یہ تو سچ ہے۔“

”دیکھ لو اتنی عمر ہو چکی ہے۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے کیا؟ وہی چھیڑ خانی۔ لاحول ولاقوت۔“

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی متبتم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو کر واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا ایپائر بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرتے۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے۔ چچا جی ہمارے آڑی نہیں گے۔“ نہیں ہمارے۔“ ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں۔ ”لو دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ چق کی اوٹ میں سے آواز آتی۔“ ”بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے“ سبز جٹکے سے شاداں سر نکالتی ”ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی۔ شاہ نشین سے چاچی بولتی۔ ”توبہ شاداں تو بھی کسی رخ چین لینے نہیں دیتی۔ شکر کر کہ احسان صلی کا دھیان اور کھیلوں سے بٹا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے۔“ مسجد سے آتا جاتا کوئی محلے دار انہیں دیکھ کر ہنستا ”کب تک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے۔ اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔“ احسان علی ہنس کر گنگناتے ”وقت پیوری گرگ ظالم می شود پرہیزگار۔“ دوسرا آکر کہتا ”دنیا داری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی؟ صوم و صلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو۔“ احسان علی کہتے ”بابا جی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا۔“ ”لاحول ولاقوت۔“ بابا جی بڑبڑاتے ”لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آگیا۔“ احسان علی ہنس ہنس کر لوٹ ہو جاتے۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ ویران دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ سردیوں میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوکان میں اکٹھی ہو کر آزار بند بنا کرتی تھیں دوپہر کے قریب جب چوکان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں۔ مٹی کی ہنڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلہ لگ جاتا۔ ہاتھ چلتے دھاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آوازیں

پیدا کرتے۔ تیلیاں ٹکراتیں۔ آزار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی تھیں ہوتے شکایتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے۔ مگر قہقہے کی آواز نہ آتی۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے۔ حصّوں کے حوالے دیئے جاتے۔ اولیا کرام کی حکایت سنائی جاتیں۔ ہنگامہ تو رہتا مگر اس میں مزاح کی شریینی نام کو نہ ہوتی عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا۔

پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آئے ان کے بعد محلے کا رنگ ہی بدل گیا۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے محلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آنکھتے اور آتے ہی ایسی بات کہہ دیتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہو جاتے آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوکان میں قہقہے کو بجھنے لگتے۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکے سننے لگتے۔ لاحول پڑھنے والے بڑے لاحول پڑھنا بھول جاتے۔ لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اس پر احسان کھٹکھٹا کر ہنس پڑتے۔ ”بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔

پھر۔۔۔۔۔ ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا۔

چوکان میں عورتیں حسب معمول جمع تھیں۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی۔ کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو دیکھ لیا۔ چاچی کو اشارہ کر کے با آواز بلند بولی ”چاچی خدا جھوٹ نہ بلائے آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے

”میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ اس بات میں۔“

”اونہوں انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامرد کر دو۔ لیکن ان کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں اتنی عمر ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی ہوس نہیں گئی۔“

”نہ بہن“ چچی بولی ”مجھ سے تو آپ اس نے کئی بار کہا کہ چچی جہاں لڑکا کہے گا اس کی شادی کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آج کل یہ کام لڑکے کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتے، بات بھی سچی ہے۔“

”ابنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے؟ شاداں چٹائی

”سچ؟“ بھابی ناک پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ہاں بھابی۔“ نواب بی بی بولی۔ ”پہلے تو لڑکے کو ابنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی ہٹی پڑھاتے رہے اور اب اس نے ابنی بیوی کا چناؤ کر لیا ہے تو جریز ہو رہے ہیں۔“

کون ہے وہ؟ چچی نے پوچھا۔

مجھے کیا معلوم۔ اسکول میں استانی ہے۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اسکی۔ ”ہم بھی تو دیکھیں“ شاداں نے منت کی۔

”نواب بی بی اٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی۔

”ہائے چچی یہ تو میم ہے میم۔“ شاداں خوشی سے پھولی نہ سائی۔

”اے ہے۔“ چچی بولی ”ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں۔“

توہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے۔“ بھابی ہنسی۔

کتنی خوبصورت ہے۔“ شاداں بولی۔ ”احسان علی کو ایسی خوبصورت بہو کہاں سے مل سکتی ہے بھلا۔“

عین اس وقت احسان علی آگئے۔ شاداں کی بات سن کر وہ گھبرا گئے ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ پھر کمرے سے باہر جانے لگے۔ لیکن شاداں کب

چھوڑنے والی تھی انہیں ”مبارک ہو چچا۔“ وہ بولی ”نئی بہو مبارک ہو مجھے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اللہ رکھے لڑکے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔“

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا چہرہ فق ہو گیا لیکن جلدی ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولا۔ ”وہ تو بے وقوف ہے بے وقوف استا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں۔ یہاں کے لئے نہیں بھدا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا؟“

”کیوں اس کو کیا ہے؟“ شاداں بولی ”دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے۔“

یہی تو مصیبت ہے۔“ وہ سر کھجالتے ہوئے بولے۔

”آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو۔

احسان علی۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا۔“ بھابی بولی۔

”پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں ناں یہاں کر تو نہیں لایا کسی کو یہ دیکھو لو یہ

حمید کی ماں بیٹھی ہے“ وہ جوش میں بولے۔ ”دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے۔“

”کیوں نواب بی بی کو کیا ہے۔“ چچی ہنسی۔

میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چوٹے پر بیٹھ کر

برتن مانجھتی رہتی؟“

”آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت بیوی ہو۔ اس میں حرج

ہی کیا ہے؟“

شاداں مسکرائی۔

میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے۔ لیکن چچی یہ ستیریاں تو یارانہ لگانے

کیلئے ہوتی ہیں۔ یہاں کے کیلئے نہیں۔“

”ہائیں۔“ شاداں نے ناک پر اٹکی رکھ لی۔ ”احسان علی تم نے تو حد کر

دی۔“

”کوئی محلے کی سیاہ لیتا۔ پھر چاہے جہاں مرضی ہے یارائے لگاتا پھرتا۔“

احسان علی اپنی ہی دھن میں کہے گئے۔

”تو میری۔ احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔“ چاچی بولی۔

”لو اسے دیکھو نا ذرا“ احسان علی نے پھر تصویر ان کے سامنے رکھ دی۔
”یہ آنکھیں!! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں۔ تو بے آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا۔“
”اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا۔ بھلی اچھی تو ہے“ شاداں مسکرائی۔
”مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہوتا۔“ احسان علی ٹٹنگی باندھ کر اسے دیکھنے لگے۔

”لہنی بیو کے بارے میں کہہ رہے ہو۔“ چاچی ہنسی

”بیو تو جب بنے کی تب دیکھا جائے گا۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں۔
آخر مجھے بھی تو اس گھر میں رہنا ہے۔“ وہ مسکرائے۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی۔ ”ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔“

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اسی طرح کم سم ہو گئے۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھے۔ ”حمید کی ماں مجھے آپ جا کر اس سے ملنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھدے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں۔“

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ چٹکے سنائے۔ اپنے تجربے اور مشاہدہ کو پیش کرنے کے لیے آپ بیٹیاں بیان کیں۔ لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ تو وہ دلیلوں پر اتر آئے۔ لیکن اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اس دھماکانا شروع کر دیا۔ جلد ہی دھکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس پر حمید بولا۔ ”ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں۔“ اس

وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا لگتا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

دفعتاً وہ بھر جلال میں آگئے بولے۔ ”اچھا بیشک بیاہ لاؤ اسے لیکن وہ ہمارے ہاں کبھی نہ آئے کبھی نہیں۔ ہم اس سے کبھی نہ ملیں گے۔“ اس پر حمید اٹھ بیٹھا بولا۔ ”آپ کی مرضی۔“ ”لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مصر کیوں ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”میں مجبور ہوں ابا جی۔“ حمید نے کہا۔ ”ہماری شادی ہو چکی ہے۔“ ”ہو چکی ہے؟“ وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے۔ ”ہو چکی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ حقیقت ہے۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے؟“ ”ایک ہفتہ“ انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا
”یہ بات ہے تو پھر جھگڑا کیسا۔“ وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن اس کی ہنسی بے حد کھسیانی تھی۔

حمید اٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا۔ ”ایس!“
احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم تو کہتے تھے یہ کمر پڑوسیوں سے متعلق ہے۔“ ”اور کیا کہتا ابا جی۔“ حمید مسکرایا اور پھر با آواز بولا۔ ”نسرین۔ آجاؤ ابا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ ”اوہ!“ احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ”تو یہ بات ہے۔“

نسرین بڑے پُر وقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”سلام عرض کرتی ہوں۔“ سریلی آواز کمرے میں گونجی۔ وہ ایک ساعت کیسے وہ سامنے ٹٹنگی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے پھر دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہئے۔ ”بیٹھے تشریف رکھئے۔ تشریف رکھئے۔“ وہ گھبرا کر بولے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اب کیا ہو سکتا ہے خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا۔ فضول۔ ”ہاں بھئی۔“ وہ حمید سے مخاطب ہوئے تم انہیں محلے میں لاؤنا۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔“ ”سچ؟“ حمید بولا ”کیا واقعی

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوکان میں جمع تھیں نسرین نے کالا ریشمیں برقع اتارا تو ایک ساعت کے لئے وہ جھجھک گئیں۔ رسمی سلام ہوئے دعائیں دی گئیں۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے۔ جب دلہن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی۔ ایک بولی۔ ”لے بہن دلہن کا ہمارے ساتھ کیا میل۔“ شاداں بولی۔ ”کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے۔“ تیسری نے کہا۔ ”منہ پر اللہ مارا پوڈر دو دو اٹکل چڑھا ہوا ہے۔“ چوتھی نے کہا۔ ”ویسے تو چودھویں کا چاند ہے۔ احسن علی کا گھر تو منور ہو گیا۔“ ”ہاں بہن“ شاداں نے آہ بھر کر کہا۔ ”اُسے محلے والیاں پسند نہ تھیں۔“ شاداں نے سر اٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے۔ بھابی بولی۔ ”سنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے۔“ ”لاحول ولا قوۃ۔“ احسان علی کے منہ سے یہ سانخہ نکل گیا۔ شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں بولی ”لو چاچی آج تو چچا کے منہ سے بھی لاحول سن لیا۔“ احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہوا تو لگے سر کئے وہاں سے شاداں نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا، بولی ”اب کہاں جاتے ہیں آپ۔ میں تو گن گن کے بدلے لوں گی۔“ چاچی ہنسی بولی ”کیسی مبارک دلہن آئی ہے کہ احسان علی کے منہ سے قرآن کے لفظ نکلے۔“ ”پر چاچی“ شاداں چلائی ”ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی انہیں۔“ ”اے ہے شاداں“ بھابی بولی ”کیا کہہ رہی ہے تو؟“ ”ٹھیک تو کہہ رہی ہوں۔“ شاداں چمکی ”اس دن میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دور نہیں ہوتا۔“ ”اب تو اسے جانے بھی دے گی یا نہیں۔“ چاچی چڑ کر کہنے لگی ”گھر بہو آئی ہے اور تو نے اسے یہاں پکڑ رکھا ہے۔“

ہے باباجی جو عورت کی بات میں نہیں آتا۔ سب مجھ سے ہیں۔“

”لیکن اس میں بُرا کیا ہے۔“ بابا جی نے کہا ”ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا۔“

دو دن تو احسان علی کے گھر ہنگامہ رہا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ محلے کے کمین میراثی دُوم او بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آموچہ ہوئے پھر تیسرے دن جب انہیں فراغت ہوئی تو نواب نے کہا۔ ”اب کیا دلہن کے لئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کرو گے۔ اور محلے والے، انہیں تو ولیمہ کی دعوت دینی ہی ہوگی۔“

پہلے تو احسان علی شہر جا کر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے۔ پھر جب انہوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کے ساتھ حمید جانے کو تیار ہو گیا ہے تو وہ گھبرا گئے۔ ”بولے حمید کا جان ٹھیک نہیں۔ دولہا کو دلہن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں۔“ ”تو پھر میرے ساتھ کون جانے کا؟“ ”نواب بی بی نے چڑ کر پوچھا ”تو میں چلا جاتا ہوں۔“ ”وہ بولے۔ اس بات پر حمید کہنے لگا ”میرے جانے میں کیا حرج ہے اباجی۔ آپ جو گھر میں نسرين اکیلی تو نہ رہے گی۔“ احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا ”آپ جا کر نہ جانے کیا کیا اٹھا لائیں گے۔“ ”اوہ یہ بات ہے۔“ احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تو دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ اس بات پر نواب بی بی چلائی ”اے ہے

دلہن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں لوگ کیا کہیں گے۔“ احسان علی خاموش ہو گئے۔ اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لیکر دو روز کے لئے شہر چلا گیا۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے۔ چوکمان میں میٹھی بوٹی عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پھر ڈیوڑھی میں جا بیٹھے۔ لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دلہن ورن کے منہوں کی بات چھڑ گئی۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے۔ بچوں نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھ کر شور مچانے۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرين کے کمرے میں کھلتی تھی۔ اس خیال پر وہ پھر چوکمان میں آکھڑے ہو گئے چوکمان میں شاداں نے انہیں پکڑ لیا۔ اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز

انہیں کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی بار بار کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔ شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرين مسکراتی ہوئی انہیں ملی ”بولی رات کے لئے کیا بنواؤں۔“ ”جو تم چاہو۔“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ ”اوہ“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ نسرين چونک پڑی ”کیا چاہیئے آپ کو۔“ ”میں تو بھول رہی گیا۔“ وہ اپنی دھن میں بولے۔ ”کیا۔“ ”نسرين نے پوچھا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں وہ بڑبڑاتے ”میرا مطلب ہے۔“ انہیں خود سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں ان کی گھبراہٹ ہوئی نظریں جاٹے نماز پر جا پڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو۔ ”میرا مطلب ہے۔“ وہ بولے ”مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے۔“ انہیں وضو کرتے دیکھ کر نسرين نے جانے نماز پچھا دی۔ اور آپ پاس والی کرسی پر بیٹھ کر سوئیٹر بننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جانے نماز پر آکھڑے ہوئے۔ ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ مڑ کر دیکھا۔ نسرين میٹھی کچھ بن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے ”میرا مطلب ہے یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی تر پاس ہی مسجد ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرين کچھ کہے وہ باہر نکل گئے اس کے بعد انہیں پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چوکمان سے نکل گئے کھیلنے ہوئے بچوں کو دیکھتے بغیر آگے چلے گئے ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں انہیں ہوش آیا۔ سوچنے لگے۔ پھر نہ جانے مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر محلے والے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک بولا ”اس کو بھولا نہ جانیئے جو صبح گیا گھر آوے شام۔“ دوسرا کہنے لگا۔ ”آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ یہ سن کر معاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہوں۔ عین اس وقت بابا جی آگئے۔ احسان علی کو پکڑ لیا ”اگر واپس نہیں جایا کرتے احسان علی۔“ وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے اس بات پر انہیں اطمینان سا ہو گیا بولے ”یہ دیکھو میں تو نہیں آیا۔ لایا جا رہا ہوں۔“ چلو یو نہی سہی۔“ بابا جی نے کہا۔ تیسرا بولا۔ ”آخر کوئی نہ کوئی یہاں یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے تھی بہو کے دم قدم کو دعا دو بھٹی۔“ چوتھے نے کہا ”ورنہ کہاں احسان کہاں

مسجد۔ ”اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر بچھا لیا۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن بار بار ہکا بھکا ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سرخ چپلی ان کی آنکھوں تلے ناچتی۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ اف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے واہیات بو تھی۔۔۔ ہاں وہ میری کتاب ”آپ ہی آپ گنڈا تے“ کتاب؟“ نسرین کی آواز کمرے میں گونجی میں دیتی ہوں آپ کی کتاب۔ ”نہیں نہیں“ وہ چلائے ”میں خود لے لوں گا۔“ وہ اٹھ بیٹھی لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی۔ ”لاحول ولا قوۃ“ بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔ دور ہی رک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں۔ ”وہ نیلی کتاب بائیں طرف والی۔“ وہ چلائے ”وہاں رکھ دو“ انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں۔“

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں۔ دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی کیا واہیات طریقے سے میٹھی ہے۔ انہوں نے سوچا کیا نمائشی انداز ہیں۔ اور پھر چونکے ”کیا پختے نائی کی ماں نہیں آئی۔“ وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے۔ کوئی کام ہے کیا؟“ نسرین نے پوچھا۔ ”نہیں نہیں؟“ وہ گھبرا گئے ”ویسے ہی وہ سونے کو تو آئیگی نا یہاں“ ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ نسرین بولی ”میں جو ہوں۔“ ”اوہ“ وہ اڑ سیر نو گھبرا گئے ”میں جو ہوں۔ میں جو ہوں“ دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں۔۔۔۔۔ ”اوہ گیارہ بج گئے“ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا ”ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔“ نسرین نے جواب دیا۔ وقت ہی نہیں گزرتا۔

”وقت ہی نہیں گزرتا وقت ہی نہیں گزرتا“ گھڑی کراہنے لگی۔

”وہ اٹھ بیٹھی اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔

رات کو وہ گھبرا کر اٹھے۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ چینی چینی کسی نے تسخیر سے ان کے کان میں کہا سرہانے پر کالے بالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں پڑی تھیں۔ جن پر روغن چمک رہا تھا۔ ”فضول“ انہوں نے منہ بنایا۔ اٹھ بیٹھی اور باہر نکل گئے۔ صحن میں چاندنی پھکی ہوئی تھی۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں۔ بال گوری دے پچھیر کالے۔ نہ جانے انہوں نے کیوں محسوس کیا۔ جیسے ان کی زندگی کی تمام تر رنگینی ختم ہو چکی ہو۔

اندر اگر وہ سوچنے لگے۔ ”ہوں تو دو بجے ہیں۔“ ”وقت گزرتا ہی نہیں وقت گزرتا ہی نہیں“ گھڑی چلائے لگی۔

جائے نماز کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا جو ہونا تھا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا۔ حمید نے کس قدر فاش غلطی کی ہے۔ یہووقوف انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا۔ اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت انہیں نماز گویا یاد نہ تھی۔ میرے اللہ میرے اللہ دل سے آوازیں آرہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں رکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے۔

عین اس وقت شاداں چاچی کے ساتھ کوٹھے سے نیچے اتری۔ ”چپ۔“ شاداں زہر لب بولی ”وہ سو رہے ہوں گے آج تو چچا احسان علی سے وہ مذاق کر کے رہوں گی کہ یاد کریں گے۔“ چاچی بنس پڑی بولی۔ ”جھے بھی تو ہر وقت شرار میں سو جھتی ہیں۔“ ”اور وہ کیا لحاظ کرتے ہیں میرا۔“ شاداں نے کہا۔

”بائیں“ انہیں سجدے میں پڑتے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا ”میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کی جا رہی ہے۔“

”نہ جانے یہو نے کیا جادو کر دیا ہے۔“

”بچ۔“ چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی۔

”اور یہ دیکھو دلہن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔“

احسان علی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ ان کے گل آنسوؤں سے تر تھے۔

”ہائے میرے اللہ“ شاداں نے پھر اپنے آپکو سنبھالا۔

احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً منہ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرے پر بھریاں لٹک آئیں جیسے یکھٹ بوڑھے ہو گئے ہوں۔

”احسان علی“۔۔۔۔۔ شاداں چلائی۔

احسان علی سجدے میں گر گئے۔

شائستہ

”گمرو نہ سہی کوئی کونہ ہی جو جس میں ایک چارپائی پچھائی جاسکے۔“ میں نے امید بھری نظر سے ہوٹل والے کی طرف دیکھا۔ ”جی نہیں“۔ وہ لاپرواہی سے بولا۔ ”ذرا بھر جگہ نہیں ہمارے یاں شاید کل تک ہو جائے“۔ یہ چھٹا ہوٹل تھا مینجر کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ کسی اور ہوٹل تک جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شکر ہے میں اپنا سامان سٹیشن پر کلوک روم میں رکھوا آیا تھا۔ ورنہ کس قدر مشکل ہوتی ہوٹل سے باہر نکل کر کچھ دیر تو میں حیران کھڑا رہا۔ کدھر جاؤں مجھے تو کراچی کے رستوں سے بھی واقفیت نہ تھی۔ پہلی مرتبہ تو وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں گمراہٹ میں دھڑا دھڑکتا رہا۔ پھر دفعتاً مجھے ہنسی آگئی جیسے تمام مشکلات یکھٹ دور ہو گئی ہوں۔ شاید اس سے کہ میری پریشانی اور بے بسی حد سے گزر چکی تھی۔ تو صاحب نتیجہ یہ ہوا۔ کہ میں بازار اور کوچوں میں یوں ٹہلنے لگا۔ گویا کوئی بے فکر سیر کو نکلا ہو۔ اف کیا خوبصورت کوچہ ہے میں نے اس گلی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی ایک جانب فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف پارک تھا۔ جس میں بچے کھیل رہے تھے ”کبیر۔۔۔۔۔!“

دفعتاً میرے کان میں آواز پڑی میں نے مڑ کر دیکھا گلی خالی پڑی تھی۔ یہاں میرا واقف کون ہو گا۔ میں نے سوچا۔ آخر اس نام کے اور لوگ بھی ہوں گے ”کبیر۔۔۔۔۔!“ پھر آواز آئی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ فلیٹ کے چھجے پر وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔۔۔۔۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔ جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ”یہ رہا زینہ“ وہ بولی۔ اس طرف دروازے میں داخل ہو کر بائیں طرف پہلا دروازہ میں نوکر بھیجتی ہوں۔“

ثناستہ میرے چچا زاد بھائی سکندر کی بیوی تھی میں جانتا تھا کہ وہ کراچی رہتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ سکندر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن کراچی کو روانہ ہوتے وقت اماں نے مجھے تاکید کی تھی کہ سکندر سے نہ ملوں۔ اگر اتفاقاً ملاقات ہو جائے۔ اور وہ میرے وہاں ٹھہرنے پر اصرار کریں۔ تو کسی بہانے ٹال دوں۔ مجھے سکندر کے ہاں ٹھہرنے کی قطعی ممانعت تھی۔ جبھی تو تے ہوئے میں نے یہ جاتے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔ کہ وہ کس محلے میں رہتے ہیں۔

محلے میں ایک نہیں تین لڑکے ایسے تھے جنہیں کراچی میں سکندر کے گھر رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسلم تو وہاں صرف چند ایک دن ٹھہرا ہو گا۔ پھر کسی بات پر وہ سکندر سے ناراض ہو کر چلا آیا یہ خبر جب محلے میں پہنچی، تو بڑی باتیں ہوئیں۔ عزیز کو سکندر نے وہاں ملازمت دلوائی تھی۔ اس نے صرف ایک مہینہ ملازمت کی ہوگی۔ پھر انہیں بتائے بغیر وہاں سے بھاگ آیا۔ محلے میں آکر ماں سے کہنے لگا۔ ”میں ان کے یہاں نہ رہوں گا“۔ ”کیوں ان کے یہاں رہنے میں کیا تکلیف تھی“۔ اس کی ماں نے پوچھا۔ ”نہیں اماں تکلیف تو نہیں تھی لیکن میرا ان کے پاس رہنا ناممکن ہے“۔ چاہے ان کے پاس نہ رہتا۔“ اماں نے کہا۔ ”پر نوکری چھوڑ کر تو نہ آتا“۔ ”تو رہتا کہاں؟“ اس نے چڑ کر جواب دیا۔ ہر کوئی وہاں سے واپس آکر کانوں پر ہاتھ رکھتا اور کہتا ان کے گھر رہنا تو قیامت ہے۔ قیامت۔ صبح و شام لڑائی لگی رہتی ہے۔ مہمان کی شامت آجاتی ہے۔ اسلم عزیز اور سید تینوں کا خیال تھا۔ کہ سکندر کی طبیعت شکی ہے۔ بات بات پر شک کی نظر سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

اور مہمان نوازی کی تعریفیں بھی کیا کرتے۔ یہ سن کر عورتیں نمبر لب مسکراتیں اور آپس میں اشارے کرتیں۔ پھر جب وہ اکیلی بیٹھی ہوتیں تو کوئی نہ کوئی کہتی۔

”بس باہر کی کوئی آجائے سبھی اس کے سبھاؤ کی دھوم مچا دیتے ہیں۔“

”نہ جانے باہر والیاں کیا جادو کرتی ہیں۔“

”آنکھیں مٹکانا جو جانتی ہیں وہ۔“

”اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم اس کے بغیر ہی اچھی ہیں۔“ ایک حسرت بھری مسکراہٹ سے جواب دیتی۔ محلے کے بڑے بوڑھے شائستہ یا سکندر کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیتے اور کہتے اصل میں بات یہ ہے کہ میاں بیوی دونوں نے مل کر شک کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔ تاکہ مہمانوں سے جان بچی رہے بخئی خوب طریقہ ہے۔

نہ جانے کس کی بات سچی تھی۔ آیا لڑکوں کا خیال درست تھا۔ عورتوں کا یا بڑے بوڑھوں کا۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ کہ اب کوئی محلے دار سکندر کے پاس ٹھہرنے کو تیار نہ تھا۔ اگر کسی کو کراچی جانا ہوتا تو سبھی یک زبان ہو کر اسے نصیحتیں کرتے۔ ”مانا کہ وہ اپنے میں پران کے گھر نہ ٹھہرنا بھٹی میں تو تمہیں یہ مشورہ نہ دوں گی۔“

”آخر ہوٹل بھی تو ہیں وہاں“

”کیا نہیں وہاں۔ ہوٹل میں سرائے میں۔ سنا ہے بڑا بھاری شہر ہے۔“

”تو تو آپ سیانا ہے کبیر۔ بھلا دو ہنستے کھیلتے رہتے بستے میاں بیوی کی خوشی کو حرام کر دینا۔ کیا یہ اچھی بات ہے۔“ آپ سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ کہ اُن کی نصیحتوں کے باوجود نہیں بلکہ انہی کی وجہ سے سفر کے دوران بار بار میرے دل میں سکندر سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی اگر وہ مجھ سے مل گیا تو؟۔۔۔۔۔ اس پر میں گھبرا کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش

عورتیں سمجھتی تھیں ۔ سارا فساد شائستہ کا ہے کس قدر بن ٹھن کر رہتی ہے ۔ ہر وقت اللہ مارا پاؤڈر کریم اور کاجل مسکرا مسکرا کر بات کرتی ہے ۔ نوجوان لڑکوں کا کہہ ہے انہیں تو اللہ دے یہ بات ۔ ایسی عورت کے فریب میں پھنستے ہوئے دیر گنتی ہے کیا ۔ پھر خاوند نے تو جلنا ہی ہوا ۔ کیسے نہ ہو شکی مزاج نوجوان جہاں سکندر کے مزاج میں نقص نکالتے وہاں شائستہ کی محبت ، اخلاق

اگلے دن سکندر دفتر سے آئے تو ہم دونوں بالکونی میں کرسیاں جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ شائستہ بیٹی کچھ بن رہی تھی۔ پتے پرستہ وہ مجھ سے مسلسل

سکندر نے ہمیں یوں بیٹھے دیکھا تو ٹھٹھکے۔ کچھ دیر کیلئے تو چپ رہے۔ پھر کچھ کہنے کی خاطر بولے تم سیر کو نہیں گئے کبیر۔ بس ابھی جانے کو تھا۔ میں نے گہرا کر کہا۔ ”میں نے ہی روک رکھا تھا۔“ ”شائستہ بولی“ میں نے کہا وہ آئیں گے تو تمہیں ساتھ لے جائیں گے۔ اکیلا کہاں مارا مارا پھرے گا۔ ”کبیر کوئی بچہ ہے کیا۔“ ان کی ہنسی طنز آلود تھی۔ ”جو کھو جائے گا۔“ اس بات پر شائستہ گہرا کر نے کی بجائے اور بھی چپکے لگی۔ سکندر کمرے میں چلے گئے۔ اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ کر نہ جانے کیا سوچنے لگے۔ شائستہ پہلے تو مجھ سے یوں چپک چپک کر باتیں کرتی رہی۔ جیسے سکندر کو سُنا رہی ہو۔ تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں کس قدر رونق ہو گئی ہے کبیر۔ گھر بھرا بھرا منظر آتا ہے۔ آج کا دن تو آنکھ جھپکتے ہی بیت گیا۔ پھر وہ دوڑی دوڑی سکندر کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑی ہوتی۔ اور مسکرا مسکرا کر ان سے کچھ پوچھتی اور پھر وہیں سے کبیر کبیر چلائی ہوئی میرے پاس آجاتی ”یہ سُنا تم نے آج یہ باہر جانے سے بھی منکر ہیں۔ تم بھی نہ جاؤ باہر۔ جب یہ جائیں گے تبھی جانا۔ کیوں۔ پھر بھاگی بھاگی سکندر کی طرف جاتی۔ سُنا آپ نے کبیر کیا کہتا ہے۔ کہتا ہے میں موٹی ہو گئی ہوں۔ کیا واقعی موٹی ہو گئی ہوں۔ میری طرف دیکھنے نا وہ ان کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کے لیے بچے کی طرح چلائی۔ دیکھئے بھی نا۔ پھر چلا کر کہتی

ان کی بات سنی تم نے کبیر کہتے ہیں کسی کے منہ سے تعریف کی بات سن کر تمہاری باپجی کھٹنے لگتی ہیں۔ پھر ان سے مخاطب ہو کر مسکراتی۔ آپ بھی کیجئے نامیری تعریف اور متوقع اور مسحور کن محابوں سے انہیں دیکھتی۔ اس سے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے دو زمینوں کے درمیان ایک منور چاند ڈول رہا ہو۔ شائستہ کا یہ رویہ دیکھ کر میرا دل بچھا جا رہا تھا۔ امیدیں خاک میں ملی جا رہی تھیں۔ اُف میں اُٹھ بیٹھا۔ میں ذرا باہر ہو آؤں۔ مجھے جانے پر تیار دیکھ کر وہ بھائی بھائی میرے پاس آئی۔

”باہر ہو آؤں۔۔۔۔۔ وہ زیر لب گھورنے لگی۔ ذرا ٹھہرنا پہلی مرتبہ اس نے مجھ سے چھپا کے بات کی تھی۔ میرا دل از سر نو دھڑکنے لگا۔ اور آنکھ امید کی روشنی سے چمکنے لگی۔ ”میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔“ میں نے راز دارانہ انداز سے کہا۔ اور سکندر کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے سکندر کی طرف دیکھ کر منہ بنایا اور لا پرواہی سے زیر لب بولی۔ ”ان کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ بُرا مان گئے کیا۔“

بازار میں کھومتے ہوئے بار بار مجھے وہ باتیں یاد آتیں جو شائستہ نے زیر لب مجھ سے کی تھیں۔ نہ جانے ان باتوں میں کیا تھا۔ کس قدر مفہوم سے لبریز تھیں وہ زیر لب باتیں۔ اسکی باتیں ہر لحظہ اور بھی زیر لب ہوتی گئیں۔ سرگوشیاں بن گئیں پھر ان پر وعدوں کے رنگین پھول پھوٹ نکلے۔ ان کی مہک سے مسحور ہو کر میں لڑکھاتا ہوا لوٹ آیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے مجھے شدید احساس ہوا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ رنگین انگلیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ آنکھیں میری طرف دیکھ کر ڈولتیں۔ ہونٹ بوسے بغیر کچھ کہتے۔

اندر وہ دونوں بیٹھے ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ ”لو سنو کبیر مجھ سے کہہ رہے ہیں یہ بسکٹی سویر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کیوں کبیر کیا یہ رنگ مجھے سجتا ہے دیکھو بھی نا۔۔۔۔۔“ پھر وہ ان سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئی۔ اور وہ دیر تک ایک دوسرے کی باتوں میں کھوئے رہے کبھی کبھار وہ مجھے وہیں سے آواز دیتی۔ لیکن میرا جواب سننے بغیر پھر سے اُن سے

باتوں میں لگ جاتی۔ ادھر میں اپنی خوابوں کی تعبیر دیکھنے کی توقع میں بیٹھا تھا منتظر تھا کہ وہ آئے اور دھیمی آواز میں مجھ سے کچھ کہے۔ ”ان کی عادت ہی ایسی ہے“ یا کچھ اور لیکن وہ نہ آئی۔ حتیٰ کہ میں بار کر لیٹ گیا۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول ہو گیا۔ سکندر کی غیر حاضری میں وہ کرسی سے کرسی جوڑ کر بیٹھ رہتی۔ باتیں کرتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہنستی۔ میں بار بار اُٹھ بیٹھتا۔ میں سیر کر آؤں۔ وہ پیار سے مجھے گھورتی ”بیٹھو نا شام کو چلے جانا۔ بس کوئی نہیں جانا وانا۔۔۔۔۔ چائے پی لو۔ جب وہ آجائیں گے تو چلے جانا۔ بیٹھو بھی ناکبیر۔ میرے پاس بیٹھنے سے ڈرتے ہو کیا؟“۔۔۔۔۔ ہر بار میں مجبور ہو کر بیٹھ جاتا۔ اسی طرح شام ہو جاتی اور سکندر آجاتے وہ ہمیں یوں بیٹھے دیکھ کر باری باری دیوار دروازے اور ماما کو گھورتے اور پھر اپنے کمرے میں جا داخل ہوتے۔ ن کی خشمگینی دیکھ کر شائستہ مسکراتی۔ پھر ان کے پاس جا بیٹھتی ہنس ہنس کر اُن سے باتیں کرتی۔ اس کی باتیں سن کر ان کا غصہ اور بھی چمکتا حتیٰ کہ وہ اعلانیہ ہماری بے تکلفی پر آوازے کئے شروع کر دیتے۔ ان کی باتیں سن کر شائستہ کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔۔۔۔۔ پھر کسی نہ کسی بہانے وہ چپکے سے میرے کمرے میں آکر کہتی ”تم چپ کیوں ہو گئے کبیر۔ ناراض تو نہیں ہو گئے۔ خدا کے لئے برا نہ مان لینا۔ اُن کی تو عادت ہی ایسی ہے بات کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔“ اس کی باتیں اس قدر راز دارانہ ہوتیں۔ کہ میری امیدوں کے خشک دھبے میں تیل پڑ جاتا۔ سکندر بُرا مانتا ہے تو پڑا مانے میں لا پرواہ ہو جاتا۔ اگرچہ اس کی باتوں کے جواب میں میں صرف یہ کہا کرتا۔ ”اچھا۔ تمہاری مرضی۔“ اور پھر سیر کو نکل جاتا۔

جب میں سیر سے لوٹتا تو دیکھتا کہ سکندر غصے کی بجائے ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ اور شائستہ اسے بھرمار رہی ہے۔ صبح سویرے وہ اُٹھتے ہی پیار محبت کی باتیں شروع کر دیتے۔ پھر سکندر دفتر چھا جاتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد دفعتاً شائستہ کو احساس ہوتا کہ میں ابھی وہیں ہوں اور وہ بھائی بھائی میرے پاس آتی اور ایسی گرمجوشی سے ملتی گویا اپنی گزشتہ لاپرواہی کی تلافی کر رہی ہو۔ اپنی کرسی میرے پاس کھینچ لیتی۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔

”جانا وان کوئی نہیں“۔ وہ مجھ سے آنکھیں ملا کر آہستہ سے بولی۔ اور پھر سکندر کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ ”اسے گود میں لے کر بیٹھ رہتی ہو شرم نہیں آتی تمہیں“۔ سکندر غرایا۔ ”کیا کہے گا گھر جا کر۔۔۔۔۔ یہاں سیر کے لئے آیا ہے۔ یا تمہارے دام میں پھنسنے کے لئے“۔ میں نے سنا تو میرے

مرتبہ دیکھا ہو۔ نہیں میں نہیں جاؤ گا میں نے ہنس کر کہا اور پھر پیار سے اس کا سر تھپکنے لگا۔

دوپہر کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا۔ گویا ہمارے درمیان کا آخری پردہ اٹھ چکا ہے۔ میں اس سے ایک پراسرار قرب محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں منزل تک پہنچ چکا تھا۔ میرا دل دھڑک نہیں رہا تھا۔ زبان بند نہ تھی ہاتھ جیب کے کونے تلاش نہیں کر رہا تھا۔ اس کی رنگین انگلیاں رنگین تو تھیں مگر مکڑی کی ٹانگوں کی طرح چاروں طرف سے میری طرف بڑھنے کی بجائے اپنے ہی ارد گرد رنگ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں کسی بے نام قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس روز میری گپیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ مجھے نئی نئی باتیں سوجھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ شائستہ سکندر کی طبیعت کو کیا ہے؟ ”بے نا“ وہ مسکرائی بڑی شکی طبیعت ہے۔ جانے کیوں۔ تمہارا دل تو نہیں کڑھتا“ میں نے پوچھا۔ اس نے آہ بھری۔ ”ان دنوں بھی ایسے ہی تھے۔ ابھی تک اپنی عادت کا احساس نہیں انہیں۔“ ”کن دنوں“۔ میں نے ویسے ہی بات کو لمبا کرنے کے لئے پوچھا۔

”چپ ہماری شادی ہوئی تھی۔ ان دنوں کی یاد آتی ہے تو میں بے ساختہ ہنس دیتی ہوں۔“۔۔۔ وہ ہنس کر بولی تم سے کیا چھپانا ہے۔ میری اپنی خواہش تھی کہ میری ان سے شادی ہو جائے۔ ”سچ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ہاں“ وہ جھینپ کر بولی۔ ان دنوں سکندر صاحب اور میرے پھوپھی زاد بھائی کرامت دونوں ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رہنے کو مکان نہ ملتا تھا۔ اس لئے مجبور تھے۔ میرے بھائی کی سکندر صاحب سے بڑی دوستی تھی۔ اس لیے ہم سب ان کو اپنا ہی سمجھتے تھے۔ ان سے پردہ بھی اٹھا رکھا تھا۔

”تمہیں سکندر سے محبت تھی؟ میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ شرما کر چپ ہو گئی۔ پھر اپنا آپ سنبھال کر بولی۔ تم جانتے ہو مجھے ادب سے عشق تھا عشق اور یہ پورے ادیب تھے۔ مجھے پڑھایا کرتے تھے ان دنوں بس جی ہم تو ان سے پڑھنے ہی میں لٹ گئے اف کس قدر قابل ہیں۔ یہ

میں تمہیں کیا بتاؤں مجھ پر تو پہلے دن ہی ان کا رعب پڑ گیا۔ چوری چوری انہیں دیکھا کرتی تھی۔ یہ پڑھانے میں مشغول ہوتے اور میں ان کے منہ کی طرف دیکھا کرتی۔ ان کی عادت تھی۔ کہ پڑھاتے ہوئے میری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے پھر میں نے بامعنی انداز سے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

وہ مسکرائی۔ ”ان کی بلا سے یہ تو ہر وقت اپنی کتابوں اور مطالعہ میں کھوئے رہتے تھے۔ ان کی مصروفیات لامتناہی تھیں۔ اس بات پر میرا دل جلتا تھا۔ جی چاہتا تھا کسی طریق سے ان کی کتاب چھین لوں لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ خیر جتن تو میں نے بھی بہت کئے“ وہ مسکرائی ”لیکن کوئی بات نہ بنی اور یہ اپنے شغل میں منہمک رہے۔۔۔ پھر اتفاق سے ایک ذریعہ نکل آیا۔“

”وہ کیا“ میں نے شوق سے پوچھا۔

”میری عادت تھی کہ کرامت بھائی سے روز کھیلتی، گپیں مارتی اور لڑتی جھکرتی رہتی۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا نا۔ چھ ایک ماہ چھوٹا ہو گا۔ ہم دونوں بہت بے تکلف تھے۔ ایک روز ہم دونوں حسب معمول بیٹھے ایک دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کہ سکندر صاحب آگئے۔ ہمیں اگلے دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن سنبھل کر جلد ہی واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شام کو جب میں سبق پڑھنے کے لیے ان کے پاس گئی تو دیکھتی ہوں کہ منہ سوچ کر کپا بنا ہوا ہے۔ خیر انہوں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ لیکن ایسی بے دلی سے پڑھا رہے تھے۔ میں تاڑ گئی۔ ایک روز پڑھاتے ہوئے انہوں نے مجھے بے توجہ پایا۔ تو تیک کر بولے ”بس جی میں نہیں پڑھا سکتا تمہیں۔ اب اسی سے پڑھا کرو۔ اپنے کرامت سے جس سے سارا سارا دن خوش گپیاں ہانکتی ہو“ میں نے ان کی طرف دیکھا آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ بس جی پھر کیا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس روز۔ پانی گرم تھا۔ صرف ایک جوش دینے کی ضرورت تھی۔ صرف ایک، کس قدر چوکھا رنگ آئے گا چائے کا۔ میں نے سوچا۔ اس کے بعد میں نے کرامت سے اور بھی بے تکلفی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اماں مجھے گھورنے لگیں۔ بھائی جان بھی گرم

باہی چپکے سے اچھے سے پوچھتی۔ ”اچھے وہ کہاں ہیں؟“ ”وہ؟“ اچھا، آنکھیں چمکا کر راز دارانہ انداز سے کہتا۔ ”نہیں نہیں؟“ باہی ہنس پڑتی۔ تو اچھا اس سے پوچھتا۔ ”بلا لاؤں“ نہیں، نہیں“ باہی اسے پیار سے گھورتی ”ہاں ہاں“ وہ جواب دیتا ”نہیں نہیں کو“۔ ”نہیں“ باہی ہنستے ہوئے اسے ڈانٹتی اس پر اچھے کا منہ لٹک جاتا اور وہ جل کر کہتا۔ ”تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا باہی، کبھی کبھی کچھ“ اور باہی ہنستی، ہنسے جاتی۔

اچھا، سچ کہا کرتا تھا۔ ”باہی کا کیا اعتبار۔ کہتی کچھ ہے کرتی کچھ اور۔“ باہی کی اس عادت پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے باہی ذرا اچھی نہیں لگتی۔ وہ اچھے سے مل کر سارا دن شور مچایا کرتی۔ یہ دیکھ کے میں چپکے سے بھائی جان کے کمرے میں جا بیٹھتی اور کتاب پڑھنے لگتی۔ بھائی جان میری طرف دیکھتے اور مسکرائے جاتے۔ ان کی خاموش مسکراہٹ کس قدر پر اثر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے۔ صرف ہونٹ ہی نہیں جیسے کہ باہی کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا۔ بھائی جان اپنی کرسی کھینچ کر میرے پاس آ بیٹھتے۔

”بہت جی لگتا ہے تمہارا پڑھنے میں سگی“۔ میری ہنسی ٹھل جاتی۔ اس پر وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے کہتے۔ ”عجیب انداز سے ہنستی ہو تم سگو۔ بہت خطر ناک ہوتی جا رہی ہو۔“ بھائی جان کی عادت ہی ایسی ہے چپ چاپ بات کر دیتے ہیں، نہ بھی کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ بن بولے باتیں کر رہے ہوں۔ اس کے باوجود باہی یہ سمجھتی ہے کہ وہ بات نہیں کرتے۔ اور کہیں بھی تو گھبرا جاتے ہیں۔ میرے سامنے تو وہ ذرا نہیں گھبراتے۔ ان کے کمرے میں چلی جاتی ہوں، تو آپ ہی آپ بات چھیڑ دیتے ہیں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ توبہ۔ میں ان کا مذاق نہیں اڑاتی نا۔ اس لئے۔ اور باہی؟ باہی کو تو ہر وقت یہ فکر رہتا ہے کہ انہیں پریشان کرے۔ پھر بھائی جان گھبرا جائیں تو ان کا قصور؟ لیکن بھائی جان بھی تو حد ہیں باہی کے سامنے جا کر گویا سمدھ بدھ نہیں رہتی، منہ سے بات نہیں نکلتی۔

اس روز جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آئے تھے۔ اماں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی کہ یکایک میں اور باہی اسکول سے آ پہنچیں۔ بھائی جان نے باہی کی طرف دیکھا اور یوں گھبرا گئے جیسے کسی غیر کے آنے پر کوئی لڑکی گھبرا جاتی ہے۔ ہم بھی انہیں دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ اور جلدی سے باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت ہم نے اماں کی ہنسی سنی۔ ”اے ہے اپنی منیر اور صفیر میں“۔ ”مٹی؟“ بھائی جان نے حیرانی سے دہرایا۔ ”اتنی بڑی ہو گئی ہے؟“۔ اماں ہنس کر بولی ”دسویں میں ہے۔“ پھر اس نے باہی کو آواز دی ”منیر بیٹی یہاں آ۔ تیرے بھائی آئے ہوئے ہیں۔“ باہی باورچی خانے میں داخل ہوئی تو بھائی جان پھر سے گھبرا گئے۔ ”السلام علیکم۔“ وہ مسکرائی جیسے کہ اس کی عادت ہے۔ ”ایک دم اتنی بڑی ہو گئی ہو۔“ وہ عینک صاف کرتے ہوئے بولے ”ان لڑکیوں کو بڑھتے ہوئے دیر لگتی ہے کیا؟“ اماں کسی کام سے باہر جاتے ہوئے بولی۔ اماں کے جانے کے بعد بھائی جان اور بھی گھبرا گئے۔ کچھ کہنے کی خاطر بولے ”دسویں میں ہو؟“ ”ہوں“ باہی نے شان سے کہا۔ ”اور تم؟“ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”آنٹھوس میں“ میں نے جواب دیا۔ پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ ہر بار عینک صاف کرتے۔ چوری چوری باہی کی طرف دیکھتے اور گھبرا کر مجھ سے کوئی سوال پوچھ لیتے، باہی ان کی گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے جاتی۔ اس کی مسکراہٹ کو محسوس کر کے بھائی جان اور بھی پریشان ہو جاتے۔

”سگو“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہاری باہی تو ایک دم مٹی سے منیر بن گئی اور تم وہی سگی کی سگی رہیں۔“ اس بات پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے کہا کیوں میں کیا بچہ ہوں؟ تیرھویں میں ہوں ”نہیں نہیں“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا، کیوں مون انہوں نے باہی کی طرف دیکھا۔ ”میں کیا مون ہوں؟“ باہی نے گھور کے کہا۔ ”تو اور کیا؟“ بھائی جان کے ماتھے پر پسینہ آگیا ”اے ہے، ملتے ہی لڑنے بھی لگے“ اماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ لو چاچی۔“ بھائی جان چمک کر بولے اس کی عادت ہی ایسی ہے۔ ”اماں ہنسی ”نہیں نہیں“ بھائی جان گھبرا کر بولے ”نہیں نہیں“ اس پر باہی کھلکھلا

کی شادی ہوگی تا“ ”ولایت!“ باجی کھلکھلا کر ہنس پڑی ولایت سے باجی کو چڑھتی تھی۔ اس لئے ولایت کا نام آجاتا تو ایسا منہ بناتی جیسے کوئی پھس پھسی چیز منہ میں آپڑی ہو۔ بات بھی ٹھیک ہے، واقعی ولایت پھوہڑا اور بد مذاق ہے۔ سارا سارا دن مصلے پر بیٹھ رہتی ہے، مصلے سے انھی تو برتن دھونے لگی۔ کپڑے دھونے سے تو اسے عشق ہے۔ بات کرو تو مصلے چھیڑ دیتی ہے اور چپ بیٹھی ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تسبیح کر رہی ہو۔

بھائی جان نے بہتیرا کہا کہ منگنی کوئی نہیں ہوئی۔ ویسے ہی لوگوں نے بات چلا دی ہے۔ لیکن اماں کب ماتے والی تھی بولی ”مانا ڈھولک نہیں بجی باجے نہیں بجے۔ لیکن بات تو پکی ہو چکی ہے۔“ اور باجی ہنس ہنس کر چنچنے لگی۔ ”میں نے بھی کہا۔ بھائی جان کو ولایتی چیزوں سے عشق کیوں ہے۔“ اچھا چلایا۔ ”بھائی جان کا میاں ہو گا۔ ابا بھائی جان کا میاں ہو گا۔“ ”نہیں نہیں۔“ بھائی جان گھبرا کر بولے۔ اور پھر دفعتاً چپ ہو گئے۔ ”نہیں نہیں۔“ باجی نے اچھے کو مذاق سے گھورا۔ ”نہیں نہیں“ دولہا بنیں گے میں جانتا ہوں“ اچھا چنچنے لگا۔ ”گھوڑے پر چڑھیں گے۔“ توہ ان سب نے مل کر ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس پر بھائی جان کھسیانے ہو کر چلے گئے۔

اگلے روز کھانے کے وقت حسب معمول اچھا باجی کے پاس آکر کہنے لگا۔ ”باجی بلاؤں بھائی جان کو“ اوس ہوں“ باجی نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا۔ ”وہ تو اپنے کمرے کو ولایت بنا کر بیٹھ رہتے ہیں۔“ عین اس وقت بھائی جان آہنچے۔ باجی کی بات سن کر انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اُف وہ ایک نظر جیسے گھور رہے ہوں، فریاد کر رہے ہوں۔ میرے بدن میں تو سو میاں سی چھینے لگیں۔ لیکن باجی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہے۔ وہ اور بھی چکی۔ ہنستے ہوئے اچھے سے پوچھنے لگی۔ ”کیوں اچھے تم دیسی ہو یا ولایتی“ ”ولایتی ہے۔“ اچھا شپٹا کر بولا ”وہ کیا ہوتا ہے باجی؟“ ”وہ جو ولایت میں بنے“ باجی نے ایک انداز سے کہا۔ ”بھائی جان کیا میں؟“ اچھے نے پوچھا۔ ”باجی نے ایک آڑھی نظر بھائی جان پر ڈالی۔ ”اور تم“ اچھے نے پوچھا ”ہم تو دیسی ہیں“ باجی

کر ہنس پڑی۔ اتنے میں اچھا دوڑا دوڑا آیا اور اچک کر بھائی جان کی گود میں بیٹھ گیا۔ باجی نے منہ پکا کر اچھے کو گھورا۔ ”نہیں نہیں اچھے۔ نہیں نہیں۔“ اور ہم سب ہنس پڑے۔ ”دیکھا بھائی جان یہ ہے میری باجی یہ سکول گئی ہوئی تھی اچھا آنکھیں چمکا کر بولا اچھی ہے نا۔ یہ سن کر باجی گھبرا کر باہر نکل گئی۔ دو ایک منٹ کے لئے تو وہ بیٹھے عینک صاف کرتے رہے پھر پسینہ پونچھ کر بولے ”تمہاری باجی تو قصائی ہے“ ”قصائی؟“ اچھے نے دہرایا بھائی جان نے اچھے کو پچکار کر کہا۔ ”اونہوں چنچو نہیں۔“ ”پنچیں تو کیا ہوتا ہے؟“ وہ بولا۔ ”قصائی بگڑ جاتا ہے“ بھائی جان نے جواب دیا۔ ”پڑی بگڑے، ہمیں کیا پروا۔“ اچھے نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہمیں تو ہے“ بھائی جان مسکرائے۔ ”کیوں کیا بکرے ہو؟“ اور چنچتا ہوا باجی کی طرف بھاگا۔ ”باجی باجی بھائی جان بکرا ہیں۔“ باجی یہ سن کر ہنسنے لگی ”اور تم؟“ اچھے نے منہ پر اٹھلی رکھ کر کہا۔ ”تم قصائی۔“ ”چپ شیطان کہیں کا۔“ باجی نے پیار سے اسے گھورا۔ بھائی جان کو پاس سے گذرتے ہوئے دیکھ کر وہ اچھے سے کہنے لگی ”ہمیں نہیں چاہیئے ایسا ویلا پتلا بکرا“ ”کیسا چاہیئے۔“ اچھے نے پوچھا۔ ”موتا ہو چربی والا ہو“ وہ مسکرائی اچھا بھائی جان کی طرف بھاگنے لگا تو باجی نے ہنستے ہوئے اسے پکڑ لیا، جیسے واقعی سے روکنا چاہتی ہو۔ توہ باجی کو کیسے ڈھونگ رچانے آتے تھے۔ میں کیا سمجھتی نہیں۔ وہ تو بلکہ آپ چاہتی تھی کہ اچھا جا کر ساری باتیں بھائی جان سے کہہ دے۔ اسی لئے تو وہ اچھے سے ایسی ایسی باتیں کیا کرتی۔ اچھے سے کچھ کہنا اور پھر توقع رکھنا کہ وہ چنچ چنچ کر اسے دہرائے گا نہیں۔

اگر اماں ولایت کا ذکر نہ کرتی، تو بات نہ بگڑتی۔ لیکن اماں! اماں کو کون سمجھائے!! وہ تو بن سوچے سمجھے بات کر دیتی ہے۔ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ اماں بولی ”نذیر اپنی شادی کا بھی کچھ فکر ہے۔“ ”شادی!“ بھائی جان کا رنگ اڑ گیا۔ باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے ”مجھے فکر کرنا ہے؟“ ”اے ہے“ اماں بولی۔ ”ولایت اب جوان ہے۔ آخر وہ کب تک انتظار کریں گے“ ”ولایت!“ باجی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”ہاں ہاں“ اماں نے کہا۔ ”تمہارے پھوپھا کی لڑکی۔ اس سے نذیر

کچھ دیر بعد یاجی کی آواز آئی اور بھائی جان کر سی سے اٹھ کر اوندھے منہ پلنگ پر لیٹ گئے۔

اس کے بعد بھائی جان نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا۔ وہیں کھانا منگوا لیتے۔ اور پھر وہیں پڑھنا شروع کر دیتے۔ شام کو اندر آکر گکیں مارتے اچھے سے کھینے کی بجائے وہ باہر سیر کو چلے جاتے اور آکر سو جاتے۔ اندر آتے بھی تو اس وقت جب ہم دونوں اسکول میں ہوتیں۔

ایمان کی بات ہے بھائی جان کی اس تبدیلی پر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔
اچھا ہوا وہ باجی سے الگ تھلک ہو گئے۔ باجی سے انہیں بھونڈے مذاق اور
طعنوں کے سوا مل ہی کیا سکتا تھا۔ ہر وقت کی کھی کھی اور شور شرابا۔ لیکن
مصیبت یہ تھی۔ کہ بھائی جان نے باجی سے بات کرنی کیا چھوڑا انہوں نے تو بالکل
سی چپ کا روزہ رکھ لیا۔

[illegible]

“اماں!”

”ہاں۔ وہ کیا دیکھتی نہیں کہ آپ الگ الگ رہتے ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آپ میری وجہ سے ناراض ہیں۔“

”نہیں نہیں“ بھائی جان چلائے اور پھر دفعتاً خاموش ہو گئے۔ باجی کی ہنسی مٹ گئی۔ ”آپ مجھے خواہ مخواہ ہنسا دیتے ہیں۔“ وہ بولی ”چلو بھائی جان غصہ تھوک دو اب۔“

”تم سمجھتی ہو میں غصہ میں ہوں۔ تم سے غصے میں؟“۔ بھائی جان نے بصد مشکل کہا۔

مجھے کیا پتہ؟ باجی نے بے پرواہی سے جواب دیا

”تمہیں پتہ نہیں مون؟“ بھائی جان کی آواز میں آنسو تھے۔
”مجھے مون نہ کہا کیجئے۔“

”تو کیا کہا کروں“ بھائی جان نے مسکرائے کی کوشش کی۔
”مجھے نہیں معلوم۔“

”تمہیں کچھ معلوم بھی ہے منیر۔ کبھی معلوم بھی ہوگا۔“

”نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ ولایتی بولی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”منیر! بھائی جان تڑپ کر بولے ”کیا تم کبھی نہ سمجھو گی؟“ انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں منت سے کہا۔

”بھائی جان! چپ! وہ مسکرائی۔ اتنے میں اچھا کہیں سے آٹھلا اور اونچی آواز میں چلائے لگا۔ ”اماں دیکھو بھائی جان رو رہے ہیں۔ اور باجی انہیں چپ کرا رہی ہے۔ اتنے بڑے ہو کر روتے ہیں۔“ ”اچھے۔ اچھے“ باجی اچھے کے پیچھے بھاگی۔

شام کو جب ہم پڑھ رہی تھیں تو بھائی جان آئے اور چپ چاپ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ اور باجی کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کی میں فوراً سمجھ گئی کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایمان کی بات ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ آخر ایسی بھی کیا بات تھی جو میرے سامنے کہی نہ جا سکتی تھی۔ بھائی جان تو یہ کار باجی کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ اور

باجی؟ باجی کو ان کی خاک پر واہ نہ تھی۔ میں غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب میں اندر آئی تو باجی کے پاس ایک عجیب سا چمکدار پلاسٹک پڑا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک خوبصورت بچے کی شکل بنی ہوئی تھی۔ جس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا۔ میں نے پوچھا باجی یہ کیا ہے ”کیا؟“ باجی نے تنک کر پوچھا ”یہ“ میں نے پلاسٹک کی طرف اشارہ کیا۔ بولی ”یہ کلپ ہے“ کلپ؟ میں حیران ہو گئی ”ہاں“ باجی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میں نے بھائی جان سے کہا تھا ایک کلپ ل دو۔“ اس پر یہ تصویر کیسی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”پتہ نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”بس تصویر ہے۔“ تو باجی کو کتنے مکر کرنے آتے ہیں۔ میں کیا جانتی نہیں کیونکہ تصویر تھی۔ میں نے کئی بار اسکول میں دیکھی تھی۔ ہماری استانی نے سب کچھ بتایا تھا ہمیں۔

اس کے بعد باجی ہر وقت وہ کلپ اپنے بالوں میں لٹکائے رکھتی۔ بھائی جان اسے دیکھتے اور مسکرائے لگتے۔ اچھے نے کلپ کو دیکھ کر شور مچان شروع کر دیا کہنے لگا۔ ”یہ کیا ہے باجی۔ مجھے دو۔ میں دیکھوں“ اوں ہونہ۔ باجی مسکرا کر بولی ”یہ کھلونا نہیں“ اچھا بسورنے لگا۔ تو بھائی جان نے اسے پکڑ لیا بولے ”آؤ ہم تمہیں ایسا اچھا کھلونا دیں گے۔“ ”نہیں نہیں میں تو یہی لوں گا۔“ اچھا پھل گیا جیسے اس کی عادت ہے ”واو“ بھائی جان بولے ”یہ بھی کوئی چیز ہے۔ بالکل نیکار۔ اسے تو زمین پر لڑھکا بھی نہیں سکتے۔ ہم تمہیں موٹر لا دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے، بھائی جان اچھے کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

اگلے روز جب باجی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں بھاگی بھاگی آئی۔ کہنے لگی، منیر بیٹی اٹھ کے چاء تو بنا دے۔ تیرا بھائی دلاور آیا ہے۔ ”دلاور۔“ باجی نے حیرانی سے پوچھا ”ہاں! تیری خالہ اور خالو بھی آئے ہیں“ ”سچ؟“ وہ مسکرائی۔ ”ہاں“ اماں بولی ”دو ایک مہینے یہاں رہیں گے۔“ ”افریقہ والی خالہ؟“ میں نے پوچھا۔ ”افریقہ والی نہیں تو اور کونسی؟“ اماں نے کہا۔ ”شکر ہے بہن آئی ہے۔ توہ آٹھ سال وہیں افریقہ میں بیٹھ رہی۔ من تو لے مجھ سے۔“ ”ہماری ایک باجی بھی ہے“ باہر سے اچھے کی آواز آئی۔ ”پڑی

ہو۔“ دلاور بھائی کی بھدی آواز سنائی دی۔ ”پڑی ہو نہیں“ اچھا چلایا ”ہے۔“
 ”ہوگی“ وہ بولے۔ اتنے میں اچھا بھاگتا ہوا آیا ”باجی باجی“ وہ بولا ”بھائی جان آئے
 ہیں وہ کہتے ہیں تمہاری باجی ہے ہی نہیں چلو“ وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔
 ”چلو بھی نا“ ”نہیں نہیں اچھے“ باجی چڑ گئی ”نہیں نہیں، نہیں“ اچھا اوپچی آواز
 میں ہوا۔ ”دوسرے بھائی جان“۔ کون بھائی جان؟“ باجی نے سیک کر با آواز
 بلند کہا۔ ”وہ باہر بیٹھے ہیں“ اچھے نے کہا۔ ”بیٹھے ہوں گے“ وہ ہنسی۔ ”واقعی
 بیٹھے ہیں آؤ دکھاؤں“ اچھا بولا ”پڑے بیٹھے ہوں“۔ یہ سن کر اچھا باہر بھاگ گیا اور
 کہنے لگا۔ ”باجی ماتی ہی نہیں کہ آپ بیٹھے ہیں“۔ ”نہ مانے“ وہ ہنسی ”اس سے
 کیا فرق پڑتا ہے۔“

[illegible]

”آٹ نہیں وہ تو پاؤڈر ہوتا ہے ۔ پاؤڈر ہوتا ہے ۔ پاؤڈر“
 ”بہی نا ولایتی آٹا ۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے ۔ ولایتی آٹا وہی لکاتی ہیں جو میلی
 ہوں ۔ ورنہ ضرورت ہی کیا ہے“

چاء پینے بیٹھے تو دلاور بھائی نے باجی کے سلام کے جواب میں کہا - ”منیر تم تو ویسی کی ویسی ہو جیسے پہلے تھیں“ ”کیوں؟“ اماں بولی ”اب تو ماشاء اللہ جوان ہے، استا بڑا قد ہو گیا ہے۔“ ”قد بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے“ بھائی نے جواب دیا ”باقی تو بالکل وہی ہے۔“ باجی کا منہ لال ہو گیا۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اماں نے شاید بات بدلنے کے لئے کہا - ”اب کیا ہمیشہ کے لئے افریقہ بیٹھ رہو گے تم سب؟“ ”افریقہ؟ میں تو نہیں رہتا وہاں۔“ بھائی نے کہا ”وہ

تو رہتے ہیں نا“ اماں نے جواب دیا۔ ”تو ان سے پوچھ لینا جب وہ آئیں گے۔“
 بھائی نے ہنس کر کہا، خالہ میں تو سپاہی ہوں سپاہی۔ دو سال سے مارا مارا پھر
 رہا ہوں۔ کبھی یہاں کبھی وہاں“ اماں بولی ”میں کہتی ہوں تم نے یہ نوکری کی
 ہی کیوں جان کو آرام نہ ہو تو پیسے کو کیا کرنا ہے۔“ ”جان کو آرام کیوں نہیں۔“
 بھائی نے اماں کی طرف دیکھا۔ ”آپ ہی تو کہتا ہے تو۔ مارا مارا پھرتا ہوں۔“
 اماں بولی ”جسے مارا مارا پھرنے میں ہی مزہ آئے، وہ کیا کرے خالہ۔“ بھائی مسکرا
 دیئے۔ ”اپنا گھر نہ بسو گے کبھی؟“ اماں نے پوچھا ”گھر بسانے میں دیر لگتی
 ہے کیا۔ چار کلمے پڑھے اور گھر بس گیا۔ پھر کوئی جہاں جی چاہے بھٹکتا پھرے۔“
 وہ بولے ”تو کیا بیوی کو بھی ساتھ ساتھ لئے پھرو گے؟“ اماں نے پوچھا۔ ”اور
 کیا اسے کوٹھڑی میں بند کر جاؤں گا۔“ دلاور بھائی نے قہقہہ لگایا ”پھر تو دلاور“
 ہاتھ ملتے ہوئے اس نے کہا۔ ”کوئی فرنگن ہی کرو گے۔ یہاں کی لڑکیاں تو باہر
 نہیں پھرتیں۔“ ”نہ سبھی کوئی زبردستی ہے؟“ دلاور بھائی ہنسے ”ہائے ہائے“
 اماں نے ناک پر اٹھکی رکھ لی۔ ”فرنگن میں کیا برائی ہے خالہ“ بھائی نے ہنس کر
 پوچھا۔ ”کیوں سگو؟“ ”فرنگن کیا ہوتی ہے“ اچھا بولا۔ ”یہی جو ولایت کی ہوتی
 ہے“ اماں نے جواب دیا ”ولایت کی۔“ اس نے دہرایا ”جو بنا سیتی ہوتی ہے؟“
 اس پر ہم سب کی ہنسی نکل گئی۔ لیکن اور اچھا کب چپ رہنے والا تھا۔ بولا
 ”دوسرے بھائی جان سے جو پوچھ رہی تھی“ باجی۔“

عین اس وقت میں نے مڑ کر دیکھا بھائی نذیر دروازے میں کھڑے تھے
 دلاور بھائی سے رسمی مذاقات کرنے کے بعد وہ ابھی عینک لکھنے نہ پائے تھے۔
 کہ اچھا چھانے لگا۔ ”بھائی جان یہ سب ہنس رہے ہیں۔ یہ تے بھائی جان اور،
 اماں اور سبھی، یہ کہتے ہیں باجی باجی نہیں۔ منی ہے۔“ ”اچھے“ اماں اسے
 گھورنے لگی۔ ”سارا دن نہ چائے کیا بکتا رہتا ہے۔“ ”پچہ جو ہوا“ دلاور بھائی نے
 اماں کو خاموش کر دیا اور لگے اس سے باتیں کرنے۔ ”جھوٹ تو نہیں کہتے ہم
 اچھے پوچھ لو اپنی باجی سے“ باجی نے تینکھی نظر سے دلاور بھائی کی طرف دیکھا اور
 منہ موڑ کر مسکرانے لگی۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں پریشانی کی جھلک تھی۔
 اگلے روز ہم باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ نذیر بھائی، باجی، اچھا اور

میں۔ اچھے نے بہت کوشش کی کہ باجی کو بات کرنے پر مائل کرے۔ مگر وہ
 خاموش رہی۔ اسے نذیر بھائی کو چھیڑنے کی بھی نہ سوجھی۔ بھائی عینک صاف
 کرتے ہوئے بولے، اچھے آج تمہاری باجی کو کیا ہے۔ اچھا بولا۔ ”اوتہہ، باجی
 کا کیا ہے، کبھی کچھ کبھی کچھ۔“ ”کیوں منیر اچھا کیا کہہ رہا ہے؟“ انہوں نے بات
 چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”اس کا کیا ہے۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔“ باجی نے
 شانے جھٹک کر کہا۔ ”میں بتاؤں باجی کیوں چپ ہے، تے بھائی جو نہیں
 ماتے؟ کیا نہیں ماتے۔“ ”کچھ بھی نہیں ماتے۔ کہتے ہیں منی ہے منی۔“
 ”مجھے کیا؟“ باجی پڑ کر بولی۔ ”لوگ مانیں نہ مانیں“ بھائی جان نے بولے سے آہ
 بھر کر کہا۔ ”کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا۔“ باجی نے غصے سے مڑ کر دیکھا۔
 ”مان نہ مان میں تیرا مہمان۔“ اچھا چلانے لگا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے باجی؟“ اسے
 کہتے ہیں خواہ مخواہ“ باجی نے ہنس کر کہا۔ بھائی کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے
 ایک لمبی آد بھری اور چپکے سے باہر چلے گئے۔ بھائی کے چلے جانے کے بعد اچھا
 باجی سے لڑنے لگا۔ ”تم تو بھائی جان سے لڑتی ہو باجی۔“ ”میں لڑتی ہوں“ اس
 نے غصے سے کہا۔ ”ہم نہیں بولتے تم سے“ اچھے نے کہا، کچھ دیر وہ دونوں
 خاموش بیٹھے رہے۔

باجی نے بال سنوارنے کے لئے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا ہاتھ کلپ سے
 چھوا تو وہ یوں چونکی جیسے کسی پچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے کلپ اتار کر اچھے
 کی طرف بڑھایا ”یہ لو۔ اب تو بولو گے مجھ سے“ ”لے لوں؟“ اچھا حیرانی سے
 اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ہاں“ باجی بولی ”واپس نہیں دوں گا پھر“ اچھا بولا۔ ”نہ
 درنا“ باجی نے لاپرواہی سے جواب دیا ”مجھے کیا کرنا ہے اسے۔“

”یہ دیکھو بھائی جان۔“ اچھے نے بھائی دلاور کو کلپ دکھتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں دیکھتے۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔“ بھائی جان نے مذاق سے کہا۔ ”خواہ
 مخواہ کیا ہوتا ہے بھائی جان؟ ابھی باجی بھی کہہ رہی تھی۔“ ”تو پھر پوچھو اس
 سے“ بھائی مسکرانے لگے۔ ”وہ نہیں بتاتی۔ آپ بتائیے نا۔“ اچھے نے منت
 سے کہا۔ ”تمہیں کہہ رہی تھی؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”نہیں نہیں ان

کر ہنس پڑی ”یعنی مجھے دلچسپی ہے آپ کی باتوں سے اپنے آپ کو خوش رکھنے کے لئے انسان کیا کیا نہیں سوچتا۔“ باجی نے کہا۔ سپاہی کی بے عزتی ہو تو بدلہ لینے سے نہیں چوکتا۔“ انہوں نے باجی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ باجی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، مگر وہ اپنا آپ چھڑا نہ سکی۔ بھائی نے اسے چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”بڑا غصہ ہے تم میں منو“ ”بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی۔“ باجی چیخی۔ ”تمہیں آئینہ دکھائیں“ بھائی بولے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

اگلے دن باجی کا رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ منہ پر ملاٹت سی تھی۔ آنکھوں میں نمی سی، ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گزشتہ یاد سے متعلق ہو۔ بھائی نذیر پہلے تو اسے دیکھ کر خاموش کھڑے رہے پھر آہستہ سے بولے ”منیر“ باجی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور بے پرواہی سے منہ پھیر کر اپنا کام کرنے لگی۔ بھائی نذیر باجی کے بالوں میں کچھ تلاش کر رہتے تھے۔ بھائی بھی احمق ہیں ان کا کلپ تو پتو ہے کے پاس راکھ میں پڑا تھا۔ ”اود“ ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پاؤں لڑکھڑائے۔ ہاتھ پر پسینہ آگیا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سہم کر پیچھے بیٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

رات کو جب اماں اچھے کو لے کر پڑوس میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھی اور ہم دونوں پڑھ رہی تھیں، بھائی درور آگئے۔ باجی انہیں دیکھ کر یوں بیٹھ گئی۔ جیسے پڑھنے کے سوا اسے کسی کا دھیان ہی نہیں۔ لیکن بھائی جان کب ٹٹنے والے تھے۔ سیدھے باجی کے پاس جا بیٹھے۔ ”کیا پڑھ رہی ہو منو؟“ انہوں نے پوچھا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”ٹھیک تو ہے۔“ بھائی جان نے کہا ”انسان غصہ میں ہو تو کچھ پڑھا نہیں جاتا۔“ ”کیوں میں کیا غصے میں ہوں؟“ باجی کا منہ لال ہو گیا۔ ”پھر تو بڑے افسوس کی بات ہے۔“ بھائی جان مسکرائے۔ ”تمہاری عمر کی لڑکی ہو اور چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ نہ کھائے۔“ ”کیوں؟“ باجی نے ان کی طرف دیکھا۔ ”جوانی پر غصہ سہاگے کا کام دیتا ہے۔“ بھائی نے کہا ”میں نہیں سمجھتی آپ کی باتیں۔“ باجی نے منہ پکار کھنے کی کوشش کی۔ ”سمجھ لو تو تمہیں دلچسپی ہی نہ رہے۔“ بھائی نے جواب دیا۔ باجی کھلکھلا

بھائی نے پوچھا۔ ”بابی“ اچھے نے بابی کو چپ دیکھ کر بلانا چاہا۔ ”بابی!“ بھائی جان ہنسنے لگے۔ ”تمہاری بابی تو ”ہاں ہاں“ ہے۔“ بابی نے تڑپ کر ایک نظر بھائی جان کی طرف دیکھا۔ ”بابی نہیں، نہیں نہیں۔“ ”افوہ اچھے میاں“ بھائی جان کہنے لگے ”ہاں یہ ہے کہ جب تمہاری بابی کہے نہیں نہیں تو مطلب ہوتا ہے ہاں ہاں۔“ ”بھائی جان“ بابی منت سے چلائی۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ ”اور اگر ہاں ہاں کہے تو؟“ اچھے نے کہا۔ ”ہاں ہاں کہے تو وہ تمہاری بابی ہی نہیں۔“ بھائی جان بولے ”مجھے نہیں پتہ چلتا کچھ۔“ اچھا باہر جاتے ہوئے چلایا۔ ”بہیں تو سب معلوم ہے کیوں منی۔“ بھائی جان بابی کے قریب تر ہو گئے۔ ”آپ کو کبھی معلوم بھی ہو گا؟“ بابی نے آہ بھر کر کہا۔ ”اوہ غصے ہو گئیں۔“ وہ بولے ”آپ سے غصے؟“ بابی گنگنائی۔ بھائی دلاور اس کے قریب تر ہو گئے۔ ”اس لئے روٹھتی ہو کہ کوئی منانے؟“ بابی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ لیکن بھائی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میرا خیال تھا۔ کہ بابی ان کے منہ پر تھپڑ مار دے گی۔ لیکن اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ ہاتھ لٹک گئے آنکھیں جھک گئیں۔

راکھ میں کلب پڑا دیکھ کر وہ یوں چونکی، جیسے اسے پہلی مرتبہ وہاں دیکھا ہو۔ حالانکہ مجھے چھی طرح یاد ہے کہ اس نے کئی مرتبہ چلتے پھرتے اسے اپنے پاؤں سے ٹھکرایا تھا جیسے ٹھیکرا ہو۔ مگر اس وقت اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا اور اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی عین اس وقت اچھا آگیا۔ بابی کے بالوں میں کلب لگا ہوا دیکھ کر بولا۔ ”یہ تو تم نے مجھے دے دیا تھا بابی۔“ ”نہیں اچھے یہ دینے کی چیز نہیں۔“ بابی نے کہا۔ ”اب پتہ چلا تمہیں؟“ اچھے نے شور مچایا۔ ”ہاں“ بابی کی آواز میں ہچکی سی تھی ”تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔“

اسکے روز جب اماں خوشی خوشی سے دوڑی دوڑی آکر کہنے لگی۔ ”منیر بیٹی تمہارے خالو کا خط آیا ہے انہوں نے دلاور کے لئے تمہارا رشتہ مانجا ہے۔“ ”تو میں کیا کروں“ بابی نے چڑ کر کہا ”اے ہے“ اماں ہونٹوں پر اٹکی رکھ کر بولی۔ ”آخر تو پڑھی لکھی ہے، سمجھ دار ہے تجھ سے پوچھے بغیر میں کیا کر سکتی ہوں“ بابی نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ ”تو مجھے منظور ہے نا؟“ اماں خوشی سے

اٹھ بیٹھی۔ بابی نے دوپٹے سنبھالتے ہوئے آہ بھری اس کا ہاتھ کلب سے جا لگا۔ اس نے اسے یوں مٹھی میں دبایا جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لے رہا ہو ”ٹپ“ نہ جانے کتاب پر کیا گرا۔ اچھا جو اندر آگیا تھا بولا ”بابی تو رو رہی ہے۔“ ”چپ“ اماں نے کہا۔ ”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“ بابی نے تڑپ کر اماں کی طرف دیکھا۔ اف، وہ ایک منظر! بابی کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ”اچھا چلتا۔“ ایک ساتھ ہنستی بھی ہو اور روتی بھی۔

”جی ہاں، اور پریم نگر سے بھی۔ سبھی۔“

”بالکل؟“ سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا۔ ”خیر خیر۔ کراتی سے گاڑی ای نمبر پر آتی ہے۔ اور پھر وہ سائنڈنگ میں لگا دی جاتی ہے۔ پھر وہ نمبر ۳ سے پریم نگر کو چلتی ہے۔“

”جی ہاں، جی ہاں، نمبر ۳ سے پریم نگر کو چلتی ہے۔“ نہالچند بڑبڑایا۔

”اونو۔ نمبر چار سے چلتا ہے شٹل تھری اپ۔“ کارڈ چلایا۔

”جی ہاں، یہی کہہ رہا تھا میں شٹل تھری اپ۔“ نہالچند نے معذرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ ٹکٹ کلکٹر نے منہ بنا کر کہا۔

صرف گڑ بڑیشن اور کیا۔ ٹیشن ماسٹر صاحب۔ ایک بات ہے کہ کبھی وہ آتی ہے۔ دو پر اور کبھی چار پر۔“ کیبن مین نے وضاحت کی۔

”تو نو“ کارڈ اٹھ بیٹھا۔ ”کو سچن یہ ہے۔ کہ لوگ بھول کر پریم نگر ہی کیڑاؤرتے ہوتے ہیں۔ عقیل پوڑ نہیں۔“

”خدا آپ کا بھدا کرے۔ یہی تو ثبوت ہے کہ ناظم صاحب کا کوئی قصور نہیں۔ لوگوں کا ہے۔ لوگوں کا۔“ ٹکٹ کلکٹر مسکرا دیا۔

”ریٹ از اٹ پریم نگر کا پہاڑی علاقہ کہیں ہے کھو لھوڑت ہے اوڑ عقیل پوڑ ریت ہی ریت۔“

”لیکن حضرت سوال یہ ہے کہ جو گاڑی کراتی سے آتی ہے وہ سیدھی عقیل پور کیوں نہ چلی جائے۔ رن تھرو۔۔۔۔۔۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔“

”جی ہاں، جی ہاں۔“ نہالچند بڑبڑایا اور پھر چونک کر بولا۔ ”لیکن میں کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔“

”سلی“ لیڈی ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات نہیں چلے گی۔ مینجمنٹ کے لئے صرف ایک راستہ ہے۔ صرف ایک۔“

”لیکن۔ لیکن راستے تو دو ہیں۔“ نہالچند بڑبڑایا۔ ”دو راہا دو راستے جی؟“ ”ٹانسس“ وہ بولی۔ ”آئی مین کراتی سے گاڑی پہلے یہاں آئے۔ پھر وہی گاڑی پریم نگر چلی جائے۔ پریم نگر سے لوپ لائن عقیل پور کو چلی جائے اور یہاں سے عقیل پور کی کارڈ لائن اکھیڑ دی جائے۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی نہ رہے گا۔“

”لیکن محترمہ! یوں ہو جائے تو پھر پریم نگر جائے گا کون۔“ مسٹر امجد داخل ہوتے ہوئے بولے۔

”واٹ؟“ سٹیشن ماسٹر چلایا۔

”غلطی سے جانا اس نگر کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے سٹیشن ماسٹر صاحب!“ امجد مسکرایا۔

”اونہوں، اس بات سے ہمیں کوئی کنسرن نہیں مسٹر امجد۔ مطلب ہے کہ ہم مینجمنٹ چاہتا ہے مینجمنٹ۔“

”لیکن صاحب سوال یہ ہے کہ جو مسافر نگر میں جانا نہیں چاہتے۔“ ٹکٹ کلکٹر بولا۔

”جی ہاں، یہی کہہ رہا تھا میں۔“ نہالچند نے اپنی عینک سنواری۔ ”وہ وہاں نہ اتریں۔ سرکار کا راج ہے مہاراج۔ جبر و سستی نہیں۔“ کیبن مین بولا۔

”لا حول ولا قوۃ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔“ ٹکٹ کلکٹر کا منہ لال ہو گیا۔

”نہیں ہو سکتا تو رول نمبر ۹۲ کے مطابق وہ بریک جرنی کر سکتے ہیں۔ گڈ ایوٹنگ جنٹلمین میں ذرا چائے پی آؤں۔“ لیڈی ٹکٹ چیکر مسٹر امجد کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔

”استغفر اللہ۔“ ٹکٹ کلکٹر نے داڑھی جھاڑ کر کہا۔ ”کیا حماقت ہے۔“

”جی ہاں۔“ نہالچند بڑبڑایا۔ ”رول نمبر ۹۲۔“ اُون

”پانچ سال پہلے تو وہ تمہارا پریم نگر تھی۔ اور اب جب سے وہ پریم نگر
مکئی ہے اور بھی پیاری ہو گئی ہے۔ اس کمرے میں یوں سرگرداں پھر رہے ہو
جیسے یہ صحرا ہو۔“

”کیا کہا؟“ پروفیسر رک گیا اور دھم سے آرام کرسی میں بیٹھ گیا۔
 ”ہانس، یعنی تمہارے نزدیک ٹھلنا محبت کی دلیل ہے۔۔۔۔۔۔ ڈیش
 اٹ۔۔۔۔۔۔“ وہ جھنجھلایا ”کیا بے معنی کرسی ہے۔“

”ہائیں؟“ پروفیسر جھٹکا کر بولا۔

”میرا مطلب ہے یہ کرسی صرف اس کے لئے یا معنی ہے۔ جو آرام کرنا چاہتا ہو۔“

مردردن - مردردن - مگھٹی بجی - پروفیسر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ ”کیسی مگھٹی ہے؟“

”گجبرائی نہیں۔“ سٹیشن ماسٹر داخل ہوتے ہوئے بولا اور پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ ”دو منٹ میں آپ یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”اوہ“ پروفیسر چونکا۔ ”تو میں ریسیو کر آؤں۔ امجد تم چائے منگوا لو۔
 اتنی دور سے آمہی ہے۔ اتنی دور سے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ ہیں؟“ نہالچند رک گیا۔ ”یعنی اپنے آپ کو ریسیو کرنے جا رہے ہیں۔“

”نائنس۔“ وہ گھورنے لگا۔ ”میکم کو۔ میکم کو۔“

”اوو“ نہاچند نے آہ بھری ۔

”سوری کیٹ از آؤٹ آف دی میگ“۔ کارڈ وروازے سے چلایا۔ ”صاحب
وفا دار بیوی سے عمر بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”یعنی اُسے آنے سے روک دوں۔ تانسنس۔ مسجرائیڈ تم قطعی طور پر شادی نہ کرو۔ تم عورت کو نہیں سمجھتے۔“

”میں کیا اسے سمجھنے کے لئے یہاںوں کا۔ میں تو اس سے جرابیں
دھلواؤں گا۔ کھانا پکواؤں گا اور۔۔۔۔۔۔“

”اور اگر وہ اس نگر میں چلی گئی۔ جہاں تمہارا گورا چٹا دوست رہتا ہے؟“

”تو سمجھوں گا کہ وہ لوٹ آنے کو گئی ہے۔ اوہ پروفیسر تم پریشان ہو کر اس فکر کو اور بھی اہمیت دے رہے ہو۔“

”بالکل سبیل کا اثر - حرکت - موومینٹ - بوہیمین بنا دیتی ہے - مثلاً
 ٹانگہ والا - کوئی ٹانگہ والا دیکھ لو - ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پکنک پر آیا ہوا ہو -

ریل میں تو مسافر کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے۔ غریب آدمی بھی آنے کی گنڈھریاں چوستا ہے اور چار بیویوں والے لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو

کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں - سٹی - اور - اور ایک میشریکولیٹ پریم
نکر-----“

”تم تو وہی ہو پروفیسر۔ یہی بات ہے تو میگم کو پردہ میں ڈال دو۔“

”پردہ میں ؟ اونیونز - جوانی میں تو وہ تنگے منہ پھرتی رہی اور اب برقعہ میں چھپا کر ازسرنو خوبصورت بنا دوں۔۔۔۔۔۔ ؟ تم برقعہ کو پردہ سمجھتے ہو

کیا؟

”پردہ ہی تو ہے اور کیا“۔ امجد چڑکیا۔

”بس ریل ہی ہانکنی آتی ہے۔ یہ رنگ دار برقعے، یہ پروہ میں کیا نائنس، جیسے رنگدار بوتلیں چل پھر رہی ہوں۔ ہر کوئی دور سے بتا سکتا ہے

یہاں ابھار ہے۔ یہاں ڈھلان۔ ہونہر، پرورہ! مسجراٹھ بس شادی نہ کرنا پڑے
سنگھی رہو گے۔“

”لیکن نجھی تمہیں کیوں نہ سوجھی یہ بات۔ آج سے پانچ سال پہلے۔

”اپنی کمزوریاں ہر کسی کو پیاری ہوتی ہیں نا۔“

”ہوں۔ کسی ہوٹل میں ٹھہری تھی کیا؟“ پروفیسر نے پیالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

”آپ جانتے ہیں مجھے ہوٹل پٹری سے نفرت ہے۔ مسٹر امین کی بیوی۔۔۔۔۔۔“

”اوہ تو مسٹر امین بازی کرتی آتی ہیں آپ؟“

”میں تو پہلے ہی کوفت سے چور ہوں لیکن آپ -----“

”کوفت؟ تم تو بنگلہ میں آرام کرتی رہیں۔ مصیبت تو میرے لئے تھی۔ جو دور ہے کا پلیٹ فارم ناپتا رہا۔“

”بس جی یہ آپ کی کتابی نفسیات نہیں چلے گی“

”بس کتاب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اور نام کو آپ ہیں فیروزہ میٹرکولیٹ۔“

”مجھے میٹرکولیٹ نہ کہا کس آپ۔“ وہ غصے میں چلائی۔

”تو اور کیا گریہ بھویٹ کہوں؟“

”میں آپ کا لکچر روم نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتیا“۔

”آج کل کی کاڑیاں تو آپ چلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ دیکھ لیجئے گاڑی تو پریم نگر جا پہنچی اور بیچارہ گھوڑا دور ہانا پتا رہا۔“

”تو یہ قصور کس کا ہے ؟ وہ مسکرائی ۔

”گھوڑے کا، اور کس کا۔ دوسرا پیالہ بناؤں۔“

”بس جی آپ کی قلعی کھل چکی ہے اب -----“ اس نے ترچھی
منظر سے گھور کر لاڈ سے کہا ۔

”کیا۔۔۔۔۔ میری قلعی؟“

”جی ہاں، بہت بنا کرتے تھے۔ میں۔ میں مس امین کو نہیں جانتا۔“

— ۱۰۸ —

— 10 —

”سپرائٹمنڈنٹ - سپرائٹمنڈنٹ“ - نہالچند چلایا - ”جی ہاں - - - - - وہ آئے ہیں۔“

”کیا کہا؟“ سٹیشن ماسٹر نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں - وہ آئے ہیں - ۳۲ ڈاؤن میں - سپرائٹمنڈنٹ“ -
”گڈ لارڈ۔“

”میں ان سے ملوں گا۔“ پروفیسر اٹھ بیٹھا - ”میں انہیں یقین دلاؤں گا - کہ انتظام میں خرابی ہے - اور پسنجر کو خواہ مخواہ کوفت ہوتی ہے۔“
”اونہوں - وہ نہ مل سکیں گے - اونہوہ - بہت گزشتہ ہے۔“ کیبن مین نے داخل ہو کر کہا - سیلون کا دروازہ بند ہے -

”ٹائنس“ سٹیشن ماسٹر چلایا -

”جی ہاں ، جی ہاں ،“ نہالچند بڑھایا - ”وہی ٹائنس۔“
”یہ نہیں ہو سکتا۔“ ٹکٹ کلکٹر بھاکا بھاکا آیا - ”ضرور کوئی غلط فہمی ہے۔“

”ڈیش اٹ بات کیا ہے؟“ سٹیشن ماسٹر غصے میں بولا -

”حضرت آرڈر یہ ہے کہ ان کی سیلون عقیل پور کو جانے والی گاڑی سے لکا دی جائے۔“

”جی ہاں۔“ نہالچند بولا - ”عقیل پور کا دورہ کر کے وہ یہاں آئیں گے - آپ نے سنا۔“ اجمد نے داخل ہو کر کہا - ”لیڈی ٹکٹ چیکر کو پریم نگر کا سٹیشن ماسٹر بنا دیا گیا ہے۔“

”ٹائنس“ - سٹیشن ماسٹر چلایا -

”ابھی سپرائٹمنڈنٹ صاحب کا حکم ملا ہے ابھی - لیل - ٹی - سی - ابھی بوگی میں ہے۔“ ٹکٹ کلکٹر چلایا -

”کون سی بوگی میں؟“ سٹیشن ماسٹر نے پوچھا -

”جی ہاں۔“ نہالچند بولا - ”سپرائٹمنڈنٹ کی بوگی میں۔“
”بیونز -“ پروفیسر چلایا - ”سیکرم تم چلو میں ابھی آیا -“ مسٹر اجمد فیروزہ کو لے چلے۔“

”شوق سے۔“ اجمد فیروزہ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا - ”جلدی آنا پروفیسر گاڑی چلنے والی ہے۔“

”ٹریٹ از آل ویری سٹریٹج“ - کارڈ ہنسا -

”ول ول“ سٹیشن ماسٹر بولا - ”سٹریٹجین مین ان کی بوگی عقیل پور سے لکانے کا انتظام کرو - - - - - اچھا تو گڈ بائی پروفیسر۔“ وہ پروفیسر سے مخاطب ہوا -

”رائیٹ“ - - - - - پروفیسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا - ”سولانگ جنٹلمین سولانگ“ اور وہ دو انجن دو انجن بڑھاتا ہوا باہر نکل گیا -

”پروفیسر کہاں ہے سٹیشن ماسٹر صاحب۔“ اجمد دوڑتا ہوا آیا - ”وہاں گاڑی چلنے والی ہے اور ان کا پتہ نہیں۔“

”پروفیسر تو چلا گیا۔“ سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا -

”جی ہاں - میں نے خود دیکھا ہے - خود۔“

”کہاں۔“ اجمد چلایا - ”لو عقیل پور کی گاڑی تو چل بھی پڑی۔“ اجمد نے کوک سنکر کہا -

”پریم نگر کی گاڑی میں - جی ہاں ، دو انجن ، دو انجن کہتے ہوئے وہ اندر جا بیٹھے تھے۔“

”لاحول ولا قوۃ - کیا مصیبت ہے - اب سیکم عقیل پور جا پہنچے گی - اور میاں پریم نگر“ اجمد ہنسنے لگا -

”ڈیش اٹ آل“ - سٹیشن ماسٹر بڑھایا -

”بالکل گزشتہ ہے سٹیشن ماسٹر صاحب - - - - -“ کیبن مین بھاکتا

”خدا خبر کس نے غلط کاٹھا موڑ دیا اور۔۔۔۔۔۔“

”وہ بوگی پریم نگر والی تھری اپ سے لک گئی۔“

”اب، جی“ نہاچند بڑھڑانے لگا۔ ”یعنی میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ مرد ہے

”وہ کون؟“ امجد نے پوچھا۔

”شٹ اپ“۔ شیشن ماسٹر چیخ کر بولا۔ نانسفس

[illegible]

شاید آپ نے پہلے بھی پریم نگر کی کہانی سنی ہو، کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ آپ اسے بار بار سننا پسند کریں گے۔ یہی اس نگر کا جادو ہے۔ بڑا جادو ہے اس نگر کا۔ آپ کی آنکھیں کٹورہ سی کھل جاتی ہیں، اٹھ بیٹھتے ہیں۔ ”ہوں۔ پھر کیا ہوا۔“ واقعی اس نگر پر جادو کا اثر ہے۔ اس بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ کہتے ہیں۔ لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ کہ آیا وہ سادھو نگر کے ہاشیوں سے ناراض ہو کر سراپ دے گیا تھا۔ اس لئے وہ اندھے ہو گئے۔ یا خوش ہو کر آشیرواد دے گیا تھا۔ ”جیو۔“ اور وہ جینے لگے جب ہی سے وہاں کا سبزہ اور بھی تھملی ہو گیا۔ پھول مہک اور رنگ سے اور بھی لد گئے۔ ٹہنیوں نے بال کھول کر خوشی کے مارے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ ان کے تلے چشمے خوشی سے ٹپ ٹپ رونے لگے۔ اور ان پر بیٹھ کر کوئل نے پی پی کو بلانا شروع کر دیا۔ اور پگڈنڈیاں دوڑ دوڑ کر نگر کو آنکلیں۔ اور آسمان نے بڑھ کر اسے ستاروں بھرے نیلے دامن میں چھپا لیا۔ کہ فرشتوں کی عبادت میں خلل نہ پڑ جائے۔ چاہے یہ بات سچی ہو یا وہ۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہر حال جادو نگری ہے وہ۔

ذو نو اس نگر کا پاشی تھا ۔ اس کا گھر ایک چشمے کے کنارے تھا ۔ جو ہر سے ٹپ ٹپ روپا کرتا ۔ جس پر ٹہنیاں بال جھٹکائے سوگ مناتیں ۔ جن پر کوئل بیٹھ کر ”نر ۔ نر ۔ نر“ کوکتی ۔ ذو نو پڑے پڑے ان کی آوازیں سنتا ۔ کروٹ بدلتا ۔ ٹھنڈی آہ بھرتا ۔ اور پھر سننے لگتا ۔ ذو نو کو نرئی سے محبت تھی ۔ وہ دن بھر شر گنگناٹا ٹھنڈی آہیں بھرتا ۔ اور دنیا کی ساری چیزوں کو فانی سمجھنے میں وقت کاٹتا ۔ رات کو کروٹیں بدلتا ۔ اور سوچتا ۔ اب وہ بیٹھتی ہوگی ۔ بال کھلے ہوں گے ، ہونٹ کھلے ہوں گے ۔ اف وہ گھور کالی آنکھیں

اف ۔۔۔۔۔! حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ جاتی ۔ اور وہ لگی آنکھ دیکھنے لگتی ۔ کھلے بال کھلے ہونٹ ، گھور کالی آنکھیں اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ تصور کھو جاتی ۔ وہ تڑپ کر ادھر دیکھتا ۔ چشمہ ٹپ ٹپ روتا ۔ ٹہنیاں لٹک لٹک کر فریاد کر رہی ہوتیں دور گھاٹی میں ہوا کراہتی اور کوئل بلا بلا کر جتاتی ۔ کہ وہ نہ آئے گی ۔ نہ آئے وہ ۔ کتنی محبت تھی اسے نزی سے لیکن نزی کو اس سے محبت نہ تھی ۔ چھپنے ہی میں وہ آجو سے کھینا کرتی تھی ۔ اور کھیل ہی کھیل میں وہ آجو کی ہو گئی تھی ۔ جب اسے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کسی کی ہو چکی ہے ۔ میچاری ۔ اب کیا کرتی وہ ۔ اس لئے اس نے آجو کو اپنا لیا ۔ لیکن اسے اپنا نہ بنا سکی ۔ اور آجو نگر چھوڑ کر شہر چلا گیا ، اور وہاں سے ”لیٹی کیٹ“ پسند کرنا سیکھ آیا ۔ اور اسے لیٹی کیٹ اتنا بھایا ۔ کہ نزی اور اس کے کھیل دل سے اتر گئے ۔ نزی کو تو ذرا لیٹی کیٹ نہ آتا تھا ۔ لیکن مس فقی کیا تھی گویا لیٹی کیٹ میں جان پڑی ہوئی تھی ۔ آجو اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور مر جانے کی آرزو کرتا ۔ اس میں کوئی ہرج نہ تھا ۔ اس لئے آجو کے گھر والے آجو پر نگاہ نہ رکھتے تھے کیونکہ مر جانے کی آرزو کرنے کے لئے جیتے رہنا ضروری ٹھہرا ۔ اس لئے وہ اس کی رکھوالی نہ کرتے تھے ۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ جیتا رہے عمر دراز ہو ۔ آپ جانتے ہیں گھر والے میری نہیں ہوتے ۔

آجو فلی کو ماڈل گرل سمجھتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ مس فلی کو اس بات کا ذرا لحاظ نہ تھا کہ آجو اسے کیا سمجھتا ہے ۔ پڑا سمجھے ! ۔ سمجھے نہ سمجھے !! بات یوں تھی ۔ کہ ہر ماڈل گرل کی طرح اسے بھی ماڈرن گرل بننے کا شوق تھا ۔ اور ماڈرن گرل بننے کا شوق نہ جانے کیا کیا بننے کا شوق ہوتا ہے ۔ فی الحال فلی کو وائلن بجانے کا شوق تھا ۔ اس لئے وہ وائلن بجاتی رہتی ۔ لیکن وہ بچتی نہ تھی ۔ جبھی تو وہ اور بھی شدت کے ساتھ بجاتی تھی ۔

وائلن کے سُر وادی میں گونجتے ۔ آجو کے دل پر تیر سا لگتا ۔ اور وہ لحاف میں منہ ڈال کر ”آئی لو یو“ گنگناتا ۔ اور نزی چھم چھم روتی ۔ اور ذونو آہ بھرتا اور کروٹ بدلتا اور جنگل کے درخت سر لٹکا لٹکا کر سنتے ۔ اور پھر ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آہیں بھرتے ۔ اور چشمے دبے دبے پاؤں آگر انہیں دیکھتے

اور سرک جاتے ۔ دیکھتے اور سرک جاتے ۔ ان کی باتوں کو دیکھ کر کوئل اونچی ٹہنیوں پر بیٹھ کر بتا دینے کی دھمکی دیتی ۔ لیکن کوئل کی بات کون سنتا ہے ۔ لوگ تو پیہو پیہو سنتے ہیں اور پیہو تو درد دل دھمکی نہیں ۔

یہ سب پریم نگر کے باشی تھے ۔ ذونو ۔ نزی ۔ آجو ۔ فلی اس کی وائلن ، درخت چشمے اور کوئل ۔

ان کے علاوہ اور لوگ بھی رہتے تھے وہاں نگر میں ۔ مثلاً ذونو کی منگیتر دینا تھی ۔ جسے نگر کی وینس سمجھا جاتا تھا ۔ ایسی حسین تھی وہ ۔ اس کا حسن دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر میراگی ہو جائیں ۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سب کچھ تو چھوٹ جاتا تھا پر دینا نہ چھوڑی جا سکتی تھی ۔ مگر وہ ظالم تو آپ سبھی کچھ تھی ۔ بلکہ سبھی کچھ اسی سے تھا ۔ اور وہ آپ اس سے بھی زیادہ ۔ ایسا حسن تھا اس کا اداس اداس رویا رویا اور وہ آپ چپ چپ سی تھی ۔ نہ جاتے وہ سب کی پیاری ہونے کی وجہ سے چپ ہو گئی تھی ۔ یا چپ ہونے کی وجہ سے پیاری ۔ بہر حال نگر کے سبھی لوگ اسے چاہتے تھے ۔

کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کسے چاہتی ہے کچھ لوگ کہتے وہ کسی کو نہیں چاہتی ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جوان لڑکی ہو اور کسی کو نہ چاہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا ۔ پھر اسے چپ کیوں لگی تھی ۔ اور وہ روئی روئی سی کیوں تھی ۔ کوئی کہتا اسے ذونو سے محبت ہے ۔ جبھی تو اس نے ذونو کے گھر کے سامنے گھر بنوایا ہے ۔ اور ذونو کی کھڑکی کے سامنے کھڑکی رکھی ہے ۔ کوئی کہتا ۔ اونہوں محبت نہیں اسے تو صرف یہ پڑ ہے کہ جب نگر کے سب جوان اسے دیکھ دیکھ کر دیوانے ہوئے جا رہے ہیں ۔ تو بھلا ذونو کیوں بالا بالا رہتا ہے ۔ بہر حال چاہے اسے ذونو سے محبت تھی یا نہ تھی ۔ نگر کے جوان واقعی دینی کی محبت میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے ۔ اور اس قدر دیوانے کہ دینا کی بات بات کا ہوش تھا انہیں ۔ اب کھڑکی میں میٹھی ہے ۔ اب سیر کے لئے تیار ہو رہی ہے ۔ اب سبز سوٹ پہنا جا رہا ہے ۔ اف ۔ وہ سبز سبز کونپلوں میں دودھیا سا پھول ۔ شبنم سے بھیکا بھیکا سا ۔ اف ۔ وہ گلیوں میں نکل جاتے ۔ اور دینا کے گیت گاتے پھرتے ۔ اور بالآخر

”ذوئو“۔ منجھو لے کہا۔ ”دینا کو تم سے اتنی محبت ہے۔“ ”یہ اس کا پاگل پناہ ہے منجھو“۔ ذوئو چہنچہ لگا۔ میں نژی کا ہو چکا ہوں۔ چاہے وہ جانے نہ جانے منجھو۔ کاش کہ وہ جانتی منجھو۔ کاش!!! پھر جاتے کا کیا فائدہ جب میں نہ رہا۔ منجھو۔ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ”ذوئو“ منجھو بولا۔ ”کیا دینا سے میاہ کرنے سے انکار کر دو گے۔“ اف۔ یہی تو میں سوچتا ہوں منجھو۔ کتنی بدنامی ہوگی میری نژی کی۔ اف۔ نہیں نہیں میں دینا سے میاہ نہ کروں گا۔ میں میاہ کروں گا ہی نہیں مجھے برباد رہنا ہی راس ہے۔ منجھو ”لیکن“۔۔۔۔۔ منجھو نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ذوئو نے اسے کاٹ دیا۔ میں مجبور ہوں۔ ذوئو میں مجبور ہوں۔ اور وہ زار زار رونے لگا۔

نژی کو پتہ نہ تھا کہ ذوئو اتنا مجبور ہو چکا ہے اور یوں رو کر اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ شاید وہ جانتی بھی ہو لیکن جانتا چاہتی نہ ہو۔ اس لئے ان جان کر دیتی ہو۔ کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ بہر حال کیسی بری تھی وہ سارا قصور نژی کا تھا۔

نژی سے کوئی پوچھتا تو ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے سب ذوئو کی غلطی تھی۔ اسے نژی سے محبت نہیں کرنا چاہئے تھا۔ چونکہ چھپنے میں وہ آپ نژی کے رقعے آجو تک پہنچایا کرتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا۔ کہ وہ آجو کی ہو چکی ہے۔ اگر نژی سے محبت کرنی ہی تھی۔ تو اتنی دیر کیوں لگائی اس بات میں اگر شروع شروع میں نژی کو محبت جتنا دیتا یا کم از کم آپ ہی جان لیتا۔ اس بات کو تو بات نہ بگڑتی، اور کچھ نہ کرتا تو کم از کم رقعہ لے جانے سے ہی انکار کر دیتا۔

پتھر کا دل ہو تو کوئی ذوئو سے اس بارے میں بات کرے۔ وہ ایک آہ مار کر آپ کی طرف یوں دیکھے گا۔ کہ آپ کا دل خون ہو کر بہہ جائے گا۔ اور جی چاہے گا۔ کہ اس کے گلے لگ کر رو دیں۔ اور آپ معاً سمجھ جائیں گے۔ کہ وہ نژی کا رقعہ کیوں نہ آجو کے پاس لے جاتا۔ جبکہ اس کی خوشی نژی کی خوشی سے وابستہ تھی اور وہ کیسے جانتا کہ اسے کیا ہے۔ یہ بات بھی جانی جاتی ہے کیا۔ یہ تو انجانے میں آکر روئیں، روئیں میں بس جاتی ہے۔ اور بس پھر

کھاڑی میں جا کر مرلی بچا کر دردِ دل کا اظہار کرتے۔ اگرچہ مرلی اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر سناتی۔ لیکن کون جانتا تھا۔ کہ وہ سنا جاتا تھا یا نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ دردِ دل کا اظہار جی بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی اسے سنے۔ چاہے سن کر مسکرا ہی کیوں نہ دے ”ہونہہ“۔ یہ ہونہہ تو اور بھی اچھا رہتا ہے۔ اتنا تو پتہ چل جاتا ہے۔ کہ بات پہنچ گئی ان تک، لیکن دینا کو تو چپ لگی تھی۔ اگر وہ ہنسنا شروع کر دیتی تو شاید کھاڑی میں دردِ دل کا اظہار ہی نہ ہوتا۔ اور مرلی رونے کی بجائے کانا شروع کر دیتی۔ لیکن انجانی باتیں کون جان سکتا ہے۔

بہر حال یہ تو سبھی جانتے تھے۔ کہ ہر کوئی چاہتا تھا۔ کہ دینا اسے چاہے۔ اور ہر کوئی ذوئو کی خوش قسمتی پر جلتا تھا۔ لیکن ذوئو اپنی بد قسمتی پر روتا تھا۔

جب اس نے سنا کہ دینا اسے اس قدر چاہتی ہے۔ تو اسے اور بھی دکھ ہوا۔ کہ نژی اسے کیوں نہیں چاہتی۔ اور نژی کو اپنی محبت کی شدت جتانے کے لئے اس پر لازم ہو گیا کہ وہ دینا کی چاہت کو نژی کی محبت پر قربان کر دے جس قدر وہ قربانی کرتا اسی قدر اسے نژی پر کلمہ بڑھ جاتا۔ نژی کی بے وفائی اس میں اور بھی وفا پیدا کر دیتی۔ اور اس کی وفا سے نژی اور بھی چڑ جاتی۔ لہر وا ہو جاتی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وفا جی بھی قابلِ قدر ہوتی ہے۔ جب وہ دوسرے کی بے وفائی کے باوجود قائم رہے۔ تو ذوئو نژی سے اور بھی محبت کرنے لگا۔ اور دینا سے اور بھی بالا بالا رہنے لگا۔ اور دینا اس بات پر اور بھی چڑنے لگی۔ اور نگر کے نوجوان کے اظہارِ دردِ دل میں اور بھی درد بڑھا۔ اور مرلی کے بین اور بھی لمبے ہوتے گئے۔

جس روز دینا سے ذوئو کی منگنی ہوئی اس دن وہ کھاڑی میں بیٹھ کر اس قدر رویا اس قدر رویا کہ کھلکی بندھ گئی۔ پھر اپنے دوست منجھو کے شانے پر سر رکھ کر بولا۔ ”ہائے منجھو اب کیا ہوگا“۔ منجھو نے دلاسا دیا بولا۔ ”ہوگا کیا۔ میاہ ہوگا“۔ ”لیکن منجھو“ ذوئو بولا میں تو جیتے جی مر جاؤں گا۔ نہیں نہیں منجھو یہ کبھی نہ ہوگا۔ میں دینا کی زندگی کو تباہ نہ ہونے دوں گا۔ بیچاری دینا۔ ”لیکن

آج کو دکھ تھا تو صرف یہ کہ فلی سمجھتی نہیں۔ بھلا دردِ دل کے بغیر غم پیدا ہوا ہے کبھی۔ اور دردِ دل محبت کے بغیر۔۔۔۔۔۔ کبھی سنا ہے۔ ہو بھی جائے پیدا تو کیا وہ محبت پیدا کرے گا۔ لیکن ہر ماڈرن گمراہ کی طرح فلی سمجھتی کہ وہ سب کچھ سمجھتی ہے۔ ایک دن وہ بولی۔ ”جیون ناؤ میں پریم لاد کر پتوار پھینک دینا۔ اونہوں۔ مسٹر آجو یہ بات نہیں چلے گی۔“ آجو بولا۔

ہی لیٹ گیا۔ حتیٰ کہ فلی کی وائلن بھی تو بھی اسے خبر نہ ہوئی۔

لوگوں کو اس کی موت کی خبر ہوئی تو وہ حیران رہ گئے ”نہیں نہیں وہ مرا نہیں“۔ وہ تو چلا گیا۔ نگر چھوڑ کر چلا گیا۔ نگر میں سنسنی دوڑ گئی۔

نگر کو چھوڑ کر چلا جانا نگر کے قانون کے خلاف تھا۔ اور آپ مر جانا نگر چھوڑ جانے کے برابر تھا۔ چاہے کوئی روز مر جانے کی دھمکی دیتا اس میں کوئی ہرج نہ تھا لیکن واقعی چلے جانا یا مر جانا بالکل ہی مر جانا نگر کا قانون اسے جرم سمجھتا تھا۔ اس لئے آجو کے گھر والوں نے یہ بات چھپا رکھی۔ لیکن پتہ نہیں فلی کو کس نے بتا دیا۔ شاید وہ جانے سے پہلے رقعہ لکھ کر آپ ہی بتا دیا ہو۔ ورنہ فلی کو کیسے معلوم ہوا۔ کہ وہ اس کی وائلن میں نغمہ بن کر رہنے کے لئے چلا گیا ہے اس کے دل میں درد بن کر رہنے کے لئے۔ ایسا درد جو انگ انگ میں بستا ہے اور جان بن جاتا ہے۔ اور پھر انگلیوں کی راہ تاروں میں بکھر کر فضا میں لہریں لیتا ہے۔

نہ جانے فلی کو کیا ہوا وہ وائلن کو چھاتی سے لگا کر بیٹھ گئی۔ اور وہ بجنے لگی۔ رونے لگی۔ بین کرنے لگی۔ اور آسمان نے اپنے نیلے دامن کو دوہرا کر دیا۔ تاکہ آواز اوپر نہ نکل جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آواز فرشتوں کے کان میں پڑ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ فرشتے گھبرا کر سجدوں سے اٹھ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ خدا کرشن مہاراج بن کر ازسرنو گوگل کے بن میں آنے پر مچل جائے۔

جب لوگ پوچھنے آئے تو فلی غصہ میں اٹھ بیٹھی۔ ”کون کہتا ہے وہ آپ مرا ہے کون کہتا ہے وہ مرا ہے۔ جھوٹ۔ سب جھوٹ۔ وہ جیتا ہے وہ ہمیشہ جئے گا۔ وہ کبھی نہ مرے گا۔ ہاں وہ میری وائلن میں نغمہ بن کر جیتا ہے۔ اب میں جانتی ہوں اس نے کہا تھا اپنے چاہنے والے کو جانو۔“

نہ جانے دینا نے اس کی بات کہاں سے سن پائی۔ ”اپنے چاہنے والوں کو جانو۔“ یہ بات اس کی نس نس میں دھنس گئی۔ وہ بھاگ اٹھی۔ اور معاً اپنے

چاہنے والوں کو جانتے لگی۔ کھاڑی میں روتی ہوئی مری کے بین گونجے۔ اس نے انہیں سنا۔ اور سن سی رہ گئی۔ پھر اسے مزید جانتے کے لئے وہ چل کھڑی ہوئی۔ منجھو نے اسے آتے دیکھا۔ اور مری پہچانا بند کر دیا۔ بولا۔ ”دھن بھاگ میں میرے“۔ دینا شرما گئی۔ اس نے اسے جان لیا تھا نا۔ اس لئے وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھیں ڈال کر چلے گئے۔ ایک دوسرے کو اور جانتے کے لئے یا اپنے آپ کو بھولنے کے لئے۔ نگر چھوڑ کر چلے گئے۔

دینی چلی گئی۔ دینی نگر چھوڑ کر چلی گئی۔ نگر میں چرچا ہوا۔ کھاڑی میں مریوں نے بڑھا چڑھا کر دینا کے چلے جانے کا دکھڑا رویا شاید بڑھا چڑھا کر نہ رویا ہو۔ دکھ کو کون بڑھا چڑھا سکتا ہے۔

ادھر تڑی نے اپنے آجو کا آخری پیغام سنا۔ ”اپنے چاہنے والے کو جانو۔“ وہ گویا چونک کر بھاگ اٹھی۔ کس کے لئے جان سے چلے گئے۔ کس کی خاطر اپنی جوانی لٹا دی۔ اپنا بلیڈان دے دیا ہائے کید ہو گیا۔ اب کیا ہو گا۔ نہیں نہیں وہ گئے نہیں۔ وہ تو مجھے پریم کرنا سکھا گئے ہیں۔ پریم اپنا بلیڈان ہے مٹ کر جینا۔ ”اپنے چاہنے والے کو جانو۔“ میں پالن کرونگی میں ذونو سے پریم کی بھیک مانگوں گی۔ وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ نہ کریں تو میں پراشچیت کروں گی۔ میرا سر نہ اٹھے گا۔ اور وہ چھم چھم رونے لگی۔ چھم چھم روتی رہی۔

ذونو نے سنا کہ دینا چلی گئی نگر چھوڑ کر چلی گئی۔ اسکی آنکھ کھل گئی۔ ہاں میں جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ وہ میری خاطر نگر چھوڑ گئی ہے۔ میرے لئے اپنا آپ کھو دیا۔ ہاں میرے لئے۔ اسے مجھ سے پریم تھا نا۔ ہائے میں کس قدر اندھا رہا۔ میں نے اسے نہ جانا وہ چلی گئی۔ تاکہ مجھے مینا سے انکار نہ کرنا پڑے۔ میری نرزی بدنام نہ ہو۔ اس نے اپنا آپ قربان کر دیا۔ واقعی وہ دیوی تھی اور میں اندھا دیوانہ۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اس چلی گئی دیوی کے سامنے محبت کی جوت جدا کر بیٹھ گیا۔

فلی اپنی وائلن اٹھا کر آجو کی قبر پر جا بیٹھی۔ اسے اپنے مرے ہوئے پریشی

تین خدا

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔

چہرے اظہار جذبہ یا خیال سے خالی۔ منہ اطمینان کی شدت سے یوں سو بجے ہوئے گویا پیٹ بھر کر کھا لینے کے بعد کوئی بے حسی کا تودہ بن کر رہ گیا ہو۔ آنکھیں کھلی محض کھلی۔ نظر سے عاری۔ سامنے جہاں تک نظر کام کرتی تھی ایک وسیع ویرانہ اونگھ رہا تھا۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بے نیاز۔ بے خبر۔

لمبی داڑھی والا لمبی چوڑی کھٹا پر لیٹا ہوا تھا۔ رسیوں کے درمیان وسیع خلا تھے۔ اونچائی اور چوڑائی کو دیکھ کر محسوس ہوتا گویا کسی ”سائیکلوپ“ کیسے بنی ہو۔ اُس کی پتلی دُہلی وحوتی سے ادھر لپٹی ٹانگیں اس بڑی چارپائی کے کونے میں بے بسی سے پڑی تھیں۔ دونوں بازو اس کے بڑے سر کو تھامے ہوئے تھے۔ پیٹھ تلے ایک میلا اور بھدا کاؤ تکیہ سہارا دے رہا تھا۔ منہ چقندر سا سرخ تھا جس کے تلے سہ رنگی داڑھی سینے تک چلی گئی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ۔ پھولی ہوئی ناک۔ اور دھنسی ہوئی آنکھیں۔ جو اس پھیلے ہوئے ویرانے سے پرے دیکھنے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ۔ چونک اٹھتا جیسے اس دنیا میں آگیا ہو۔ دائیں ہاتھ سے داڑھی کی وسعت کو محسوس کرتا۔ اور پھر اس کے گلے کے نیچے پردوں سے ”آہم۔۔۔!!“ کی آواز پیدا ہوتی۔ جو اس ویرانے میں گونجتی۔۔۔۔۔!!“ اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک اور تہ چڑھ جاتی۔ پھر وہ از سر نو دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کائنات کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔

دوسرا بوسیدہ موڑنے پر بیٹھا تھا۔ لمبا چہرہ۔ چھوٹی اور شوخ آنکھیں بچکے ہوئے کال۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ جو اکثر طنز یا مسخرے سے کھل جاتے اُس

سے محبت ہو چکی تھی نا۔ اس کی وائلن سے براہ کے بین نکلے۔ نژی نے یوں محسوس کیا جیسے وہ گیت اس کے اپنے آجو کا سندیس ہو۔ میں پالن کرونگی۔ وہ بڑبڑائی۔ میں نے ذونو کو جان لیا۔ اور وہ از سر نو ذونو کے لئے چھم چھم روئے لگی۔ ذونو کو ایسا محسوس ہوا جیسے دینا جاتے ہوئے اپنے دل کا درد ہوا میں بکھیر گئی ہو۔ جو دہشت کی قربانی کا شاہد تھا۔ نہیں نہیں وہ کئی نہیں وہ۔ یہیں ہے جسم کے جانے سے بھی کوئی جاتا ہے بلکہ وہ تو نگر میں آگئی ہے میرے من کے نگر میں۔ میرے من کی دیوی۔ اور دینا کی خاطر وہ کروٹیں بدلنے لگا اور آئیں بھرنے لگا۔

پتوں نے سنا اور وہ سمٹ سمٹ کر ایک دوسرے سے لگ گئے۔ ٹہنیوں نے ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر آئیں بھرنا شروع کر دیا چشمے ٹپ ٹپ رونے لگے۔ کوئل نے پچھڑے باسیوں۔ کو یوں آوازیں دینا شروع کر دیا۔ جیسے وہ آجائیں گے۔ پکڑنڈیاں ادھر ادھر دوڑیں جیسے ”کھوئے ہوئے“ ابھی مل جائیں گے۔ آسمان نے اپنا پردہ اور بھی کاڑھا کر دیا تاکہ گئے ہوئے باشیوں کی یاد آسمانوں پر نہ پہنچ جائے۔ کہیں فرشتے بھی نہ چاہتے لگیں کہ اللہ میاں چلے جائیں اور آسمانوں پر بھی جستجو کی رنگینی کا چرچا ہو کہیں وہاں بھی ایک نگر نہ بس جائے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ مبالغہ ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ وائلن سے براہ کے بین نکلتے ہیں۔ ٹہنیاں سر دھن دھن کر سنتی ہیں۔ چشمے چمن چمن ناچتے ہیں۔ نگر کے باشی خوشی کے آنسو روتے ہیں۔ دُندیاں ادھر ادھر ناچتی ہیں۔

لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ چاہے کوئی سی بات سچی ہو۔ بہر حال نگر اور بھی بستا ہے اور نگر کے باشی اور بھی جیتے ہیں۔

سے آنکھوں میں حقارت کی دھار بہا رہی تھی۔ لمبی نوکیلی آنکھیاں ان جانے اضطراب سے بیچ و تاب کھاتیں۔ وہ پیار بھری نگاہ سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتا گویا انہیں آنکھوں سے چھو رہا ہو۔ چوم رہا ہو۔ پھر کنگھیوں سے اپنے کسی ایک ساتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتا مسخر آمیز ادھوری مسکراہٹ۔ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا اور بالآخر آسمان کے پار دیکھنے میں کھو جاتا۔ !

تیسرا کنڈی کے تحت پوش پر دو زانو بیٹھا کنگھے سے کیسو سنوارنے میں لگا تھا۔ اس کے تیل سے بھیکے ہوئے سیاہ لمبے بال شانوں پر پڑے تھے۔ گول ابھرے ہوئے چمکدار گال گویا بے حسی سے پھولے ہوئے تھے۔ شرعی مونچھوں تلے منڈی ہوئی داڑھی۔ موٹے موٹے ہونٹ آپ ہی آپ ہلنے لگتے گویا ورد کر رہے ہوں۔ وہ اپنے کیسو، کنگھے اور اپنے آپ میں مگن بیٹھا تھا۔ بالوں سے کنگھا نکالتا۔ بال بناتا پھر کنگھے کو کلپ کی طرح بالوں میں اٹکا کر۔ دونوں ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے۔ ”سبحان اللہ“ گنگناتا سامنے رکھی ہوئی پکڑی یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیتا۔ اپنے تنگے گھٹنوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتا۔ چھاتی کے بالوں کو محسوس کرتا۔ اور پھر اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر، از سر نو کنگھا محال کر بال بنانا شروع کر دیتا۔

چوتھا جو ایک عام نوجوان دکھائی دیتا تھا، ان کی طرف باری باری عقیدت سے دیکھتا۔ اور مسکراتا۔۔۔۔۔ گویا ان سے قرب حاصل ہونے پر مسرت سے پھولے نہ سماتا ہو۔۔۔۔۔ اور پھر از سر نو امید افزا نگاہوں سے باری باری ان کا منہ دیکھتا۔ وہ تینوں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے۔ اور وہ نوجوان ان تینوں میں۔

ان تینوں کے عقب میں ایک بوسیدہ اور کبڑا دالان بوسیدہ دیوار کے سہارے کھڑا ہونک رہا تھا۔ سیاہ نانک چندی لینٹوں کی دیواریں ہڈیوں کے پرانے ڈھانچے کی طرح ریختی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

ان کے سامنے ایک بیٹھا سا ٹیلا اس وسیع ویرانے کے تسلسل کو توڑ رہا تھا۔ جو سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ٹیلے پر قبریں اوٹ پٹانگ ڈھیریوں کی

طرح بکھری ہوئی تھیں۔ ارد گرد بکولے خاک اڑا رہے تھے۔ منڈ منڈ ٹہنیاں چاروں طرف تھل تھل کٹی تھیں۔ گویا پتوں کی ہوس میں سرگرداں ہوں۔ ارد گرد چاروں طرف ریت کی لہریں رنگ رہی تھیں۔

لمبی داڑھی والے نے ایک انگڑائی لی۔ اور گہری اہمیت بھری آواز سے کہنکارا۔ ”اہم۔۔۔!!“ تھوک کی پچکاری چلائی۔ اپنی آواز کی گونج سن کر اطمینان سے وہ از سر نو خلا میں گھورتے لگا۔

تراشی ہوئی داڑھی والے نے حقارت سے لمبی داڑھی والے کی طرف دیکھا۔ ہونٹ مسخر سے کھل گئے۔ اس نے اپنی سیاہ اچکن کے بٹن کھول دیئے۔ گویا کسی جذبے کی شدت سے پٹکا جا رہا ہو۔ بے خبری میں دو ایک لمبے سانس لئے۔ اور بالآخر اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے میں محو ہو گیا۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے کنگھا بالوں میں اٹکا دیا۔ منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر سامنے دھرے ہوئے بجھے ہوئے حقے کی نے کو منہ میں لے کر اسے چومنا شروع کر دیا۔

نوجوان نے باری باری ان تینوں کی طرف عقیدت سے دیکھا اور پھر دالان کی بوسیدہ دیوار کی طرف گھورتے ہوئے آہیں بھرتے لگا۔

دفعۃً منڈی ہوئی داڑھی والے نے حقہ چھوڑ کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اور پھر چھاتی کے بالوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

تراشی ہوئی داڑھی والا چومکا۔ ”استغفر اللہ ربی“۔ وہ دبی زبان میں گنگنایا۔ آنکھ میں وہی چمک لہرائی۔ ہونٹ کھلے۔ پھر وہ اچکن سے گرد جھاڑنے لگا۔

لمبی داڑھی والے نے کروٹ بدلی اور ٹانگوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ ”مولا بی مولا۔ سب رولا ہی رولا۔“

تراشی ہوئی داڑھی والے نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے لمبی داڑھی والے کے نعرے کی تصدیق کر رہا ہو۔

”وعلیکم السلام“۔ وہ تینوں باواژ بلند چلائے لیکن بوڑھے کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔

لمبی داڑھی والا عربی گنگنا نے میں نکا رہا۔ اس کی نگاہ افق کے پار دیکھنے میں لگی رہی۔ اور منٹھی دھوٹی سنبھالنے میں۔ تراشی ہوئی داڑھی والا اپنے ہاتھ دیکھنے میں شدت سے مصروف رہا اور منڈی ہوی داڑھی والا کنگھا نکال کر بال بنانے میں لگ گیا۔ نوجوان نے بوڑھے چودھری کی طرف دیکھا۔ سلام کا جواب ہونٹوں میں دب کر رہ گیا۔ لیکن وہ سرک کر چارپائی کی پاننتی کی طرف ہو بیٹھا تاکہ چودھری کے لئے بیٹھنے کی جگہ بنا دے۔

چودھری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی لاٹھی رکھ کر ان تینوں کی طرف دیکھا اور کئی بار بولنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ تینوں اپنے آپ میں کھوئے ہوئے تھے۔

”ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ گاؤں میں تشریف لائے ہیں“۔ بڑھا بالآخر کہنے میں کامیاب ہو گیا۔

لمبی داڑھی والے نے کنگھارا۔ ”اہم۔۔۔۔۔“ اور پھر تھوک کی پیک چلا کر خاموش ہو گیا۔ ہم۔ ویرانے میں آواز گونجی۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ”سبحان اللہ“ کا نعرہ لگایا۔ اور پھر پکڑی کو یہاں سے اٹھا وہاں رکھ کر چھاتی کے بالوں سے کھینٹ شروع کر دیا۔

”خدا کرے گاؤں والے ہدایت حاصل کریں؟“ بڑھا چودھری گنگنایا۔
 ”اللہ کرے!“ اچکن والا اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”آمین“۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے حقے کی کئی کو منہ میں لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر خاموش ہو گئے۔

”جب سے یہ تھی چیزیں نکلی ہیں“۔ چودھری نے ان تینوں کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بائیکوپ اور راڈیو“۔

نوجوان کی نگاہ عقیدہ منڈی سے بھیگ رہی تھی۔ مولا ہی مولا۔ اس نے دہرایا۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے نوجوان کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھا۔ مسکرایا اور پھر ہا معنی نگاہ سے ارد گرد دیکھ کر ازسرنو نوجوان کی طرف دیکھ کر یوں مسکرایا۔ گویا داد طلب کر رہا ہو۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے اپنی پکڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ پھر کچھ سوچ کر اسے اتار یہاں سے وہاں رکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ”اللہ الصمد“۔ اس کی آواز گونجی۔

تراشی ہوئی داڑھی والا جو ٹیلے کی قبروں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ چونک کر منڈی ہوئی داڑھی والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر اُس نے لمبی داڑھی والے کی طرف دیکھا جو ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ اس کی آنکھ چمکی۔ اور ہاتھ کی انگلیاں اچکن کے بٹنوں سے کھیلنے لگیں۔

نہ جانے کب تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

ویرانے میں دھول اڑنے لگی۔ بگولے ناچنے لگے۔ ریت کی لہریں رینگنے لگیں۔ لمبی داڑھی والے کی دھوٹی پھڑکی۔ اس کا لمبا سا ہاتھ دھوٹی کو رانوں میں دہانے میں لگ جاتا۔ اور پھر وہیں منٹھی سی بن کر پڑا رہتا۔ ”مولا ہی مولا“۔ اس کے منہ سے نعرہ نکل کر گونجتا۔ ”سبحان اللہ“۔ منڈی ہوئی داڑھی والا اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چلتا جیسے سامنے آئینہ پڑا ہو۔ پھر وہ حقے کی سنے کو پکڑ کر یوں چوسنے لگتا گویا وہ سنترے کی مٹھائی کی پھانک ہو اور چھاتی کے بالوں سے کھیلنے لگ جاتا۔ تراشی ہوئی داڑھی والا ارد گرد دیکھ کر مسکراتا جیسے وہ چیزوں کی اہمیت اور حقیقت سے کماحقہ واقف ہو۔ کالی اچکن سے گرد جھاڑتا۔ نوجوان سے داد طلب کرتا اور پھر سامنے ٹیلے کی قبروں کی طرف نظر ڈال کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا اور مسکراتا۔

نوجوان باری باری ان کی طرف عقیدت بھری نگاہ سے دیکھتا آہ بھرتا اور پھر والان کی بوسیدہ دیواروں کو گھورنے لگ جاتا۔

”والسلام صلیک“۔ ایک بوڑھا کسان داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”آخر کب تک میاں۔ بڑی داڑھی والا جلال میں آگیا ”خدا کی لاٹھی ہے آواز ہے۔“

”بے شک۔ منڈی ہوئی داڑھی والے نے ٹانگ اکٹا کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور محسوس کرنے لگا گویا وہ لکڑی کی بنی ہو۔“
”لیکن حضرت!“ چودھری بولا۔ ”اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کے لئے اپنے بندے بھیجتا ہی ہے۔“

”سبحان اللہ“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
”بڑی بڑی انمول ہستیاں آئیں۔“

”بڑے بڑے بزرگ۔“ لمبی داڑھی والا اپنی داڑھی کی وسعت کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے بولا۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آگیا۔ لیکن میاں کوئی جانے بھی۔ یہ لوگ۔۔۔!“ اس نے تھوک کی پٹیک چلائی ”اللہ تعالیٰ نے ان کی عقل پر تالے لگا دیئے۔ آنکھوں میں بھس بھری۔ اب کوئی کیا کرے۔“

پھر بھی اللہ کے بندوں نے کیسے کیسے کام سر انجام دیئے۔ تراشی ہوئی داڑھی والا ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”مولانا نے اعظم گڑھ میں وعظ کی تھی۔“ نوجوان نے لمبی داڑھی والے کی طرف اشارہ کیا اور دہی آواز میں چودھری سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”وعظ ختم ہونے پر کوئی آنکھ خشک نہ تھی۔“

”ان کی واعظ کی تاثیر کون نہیں جانتا؟“ چودھری گنگنایا۔

”سب مولا ہی مولا“ لمبی داڑھی والا کروٹ لیتے ہوئے چلتا۔

”اللہ کی دین ہے۔“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”زبان کا جادو ہے۔“ اچکن والا گنگنایا۔

”خیر خیر۔“ لمبی داڑھی والا بیتابی سے کہنے لگا۔ زبان بیچاری کیا کرے گی جب

تک سننے والوں کے مردہ دلوں میں وہ ذات کریم قبولیت پیدا نہ کرے، بیچارے۔۔۔۔۔!“ وہ ہنسا۔ تفریح کے لیے آتے ہیں اور پھنس جاتے

میں۔“ آپ سے برگزیدہ اصحاب نہ ہوں تو مردوں میں جان کیسے پڑے؟“
چودھری بولا۔ تراشی ہوئی داڑھی والے نے بڑی داڑھی والے کی طرف دیکھا۔
آنکھ میں وہی چمک لہرائی ہوئی کھل گئی۔

”اہم۔“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے غیر از معمول کھنکھارا اور وہ اطمینان سے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”میاں! جان ڈالنے والے کو آپ دار پر چڑھانا پڑتا ہے۔“ لمبی داڑھی والا ہنس کر بولا۔ اور پھر یوں اکڑ کر انگڑائی لی گویا دار پر چڑھا ہوا ہو۔
”اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش جو منظور ہوئی۔“ چودھری نے نوجوان سے کہا۔

”کیا ٹھکانہ ہے آزمائش کا۔“ بڑی داڑھی والا ہنسا۔

”لہنوں ہی کی آزمائش؟“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔
”قادر مطلق جو ٹھہرا۔“ اچکن والا گنگنایا۔

”اچھا بھئی۔“ لمبی داڑھی والا چلتا۔ ”گھر لے آزمائش۔ اس کی مرضی۔ ہماری مرضی کیا اس کی مرضی سے جدا ہے۔ ہم تو میاں وعظ کرنے سے باز نہیں آنے کے۔“

”جبھی تو لوگ واعظ سن کر اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں۔“ نوجوان بولا۔

”ہاں بھئی۔“ چودھری بولا۔ ”کیا مجال جو اس کی مرضی بغیر پتہ بھی ہل سکے۔“

”اعظم گڑھ میں مولانا نے غازہ اور پاؤڈر کی خوب بات کی۔“ نوجوان ہنسنے لگا۔

”ہاں۔ وہ اعظم گڑھ۔۔۔۔۔۔“ بڑی داڑھی والا ہنسا۔۔۔۔۔۔“ ہاں

ہاں۔ میاں جب ہم نے کہا کہ آج کل کا حسن بھی کیا ہے۔ منہ پونچو تو مٹ جائے۔ ہمارا مطلب سرخی پاؤڈر سے تھا۔ پھر دیکھا تو عورتیں منہ پونچ رہی ہیں۔ گویا پسینے سے بُرا حال ہو رہا ہو۔ حالانکہ گرمی نام کو نہ تھی۔

”نجات کا پسینہ!“ نوجوان مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”معظم پورہ میں میں نے اسی موضوع پر تقریر کی تھی۔“ منڈی ہوئی داڑھی والا بال بناتے ہوئے کہنے لگا۔

”خیر خیر میاں!“ لمبی داڑھی والا گنگنایا اور پھر اٹھ کر جوش میں کہنے لگا۔ ”موضوع تو وہی پرانا ہے۔ ہاں تاثیر اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے۔“ اس کا ہاتھ داڑھی پر جا پڑا۔ اور وہ محسوس کرنے لگا۔ گویا وہ تاثیر سے بھیگ رہی ہو۔

اچکن والے نے کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتا شروع کر دیا۔

”معظم پورہ میں۔۔۔۔۔“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے ازسرنو بیان کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”مولا ہی مولا۔ سب رولا ہی رولا۔۔۔۔۔“ بڑی داڑھی والے نے نعرہ لگا کر معظم پورہ کی بات ان سنی کر دی۔

”ایسا مسئلہ پھیڑیئے آج۔“ چودھری بولا۔ ”کہ مولا ہی مولا ہو جائے۔“

”مکاوں والے آپ بے تاب ہیں۔“ نوجوان نے کہا۔

”بے تاب تو ہیں۔“ لمبی داڑھی والے نے پُر تاب انداز سے کہا۔ ”پر تاب بھی لا سکیں۔“

”تاب والوں سے دُور جاتے ہیں یہ لوگ!“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”اب تو دنیا میں بے تابی کا دور ہے۔“ اچکن والا گنگنایا اور پھر مسکرا دیا۔

”واہ صاحب کیا بات کی ہے۔ کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔“ منڈی ہوئی داڑھی والے نے کہا۔

”ارے میاں!“ لمبی داڑھی والا بولا۔ ”نکتہ کیا کرے گا۔ نکتہ چین پیدا کرے گا۔“

اور کیا؟“

”ہوں۔“ تراشی ہوئی داڑھی والا بولا۔ ”نکتہ دانی تو کب کی مفقود ہو چکی۔“

”میاں! یہ عوام تو بھیڑیں ہیں۔“ لمبی داڑھی والے نے کہا۔ ”یہ کیا جانیں نکتہ شناسی؟“

”بھیڑیں ہی سہی۔“ چودھری بولا۔ ”جو کچھ بھی ہیں آپ ہی کا سرمایہ ہیں۔“

”ہمارا سرمایہ؟“ وہ ہنسا ”میاں ہمیں سرمایہ کی لعنت سے پاک ہی رہنے دو۔“ لمبی داڑھی والے نے جواب دیا۔

”یہ وہ سرمایہ نہیں حضرت!“ چودھری نے کہا۔ ”اگر ایک آدمی کے دل میں بھی حقیقی چنگاری پیدا ہو جائے تو سبحان اللہ۔“

”خیر خیر یہ تو ٹھیک ہے۔“ لمبی داڑھی والے نے داڑھی ہاتھ میں لے کر کہا: ”لیکن ایسا گڈریا بھی کیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی نہ ہو۔“

”اس کی لاٹھی بے آواز پڑی بھی تو کیا مڑا۔“ لمبی داڑھی والا ہنسا۔ اس نے اپنی لمبی داڑھی کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی لاٹھی میں جان بھی رہی ہو۔ وہ زمانہ گیا۔ جب قبر نازل ہوتے تھے۔ ورنہ آج ہی سے یہ بھیڑ خانہ اپنے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔“ معاً اس کی نگاہ سامنے ٹیلے پر پڑی اور وہ جلال میں ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کا مٹی ٹیلا ان اُجڑی ہوئی قبروں کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔“

والان کے پاس ہی پنڈال بنا ہوا تھا۔ سفید چادروں کے فرش پر تین کرسیاں پڑی تھیں جن کے پاس ایک میٹھی سی میز لگی ہوئی تھی۔ میز پر کلاسوں میں بدو کھدستے سجے ہوئے تھے۔ نیچے دو ایک پھٹی ہوئی دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر مکاؤں کے لوگ بیٹھے تھے۔

وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ لیکن ہر گھڑی ایک

منظر والان کی طرف دیکھ لیتے جہاں سے مولانا تشریف لانے والے تھے۔ ان کے انداز سے شوق اور جوش کی شدت ظاہر ہو رہی تھی۔ کئی ایک کپڑے سے ٹانگیں اور پیٹھ باندھے ہوئے بیٹھے تھے۔ کسی نے اپنی لائچی کو گھوڑا بنا رکھا تھا۔ آنکھ میں زندگی کی چمک لہرا رہی تھی۔

دفعتاً وہ خاموش ہو گئے۔۔۔۔۔ مولانا تشریف لارہے تھے۔

تینوں اصحاب والان سے نکلے اور ایک وقار سے پنڈال کی طرف آئے۔ بڑی داڑھی والے نے لوگوں کی طرف دیکھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھنکھارا۔ آہم۔۔۔۔۔!! اپنی آواز کی گونج سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کا ایک اور غلاف چڑھ گیا۔

اچکن والے نے مجمع پر نگاہ ڈالی اور محسوس کیا گویا وہ کسی بھیڑ خانے میں آگھسا ہو۔ معاً اس کے ہاتھ کی چھڑی ابھر کر عصا بن گئی۔

منڈی ہوئی داڑھی والے نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اپنا سوتھالیوں آہستہ سے ٹیکنا شروع کر دیا گویا وہ بے آواز ہو۔

وہ تینوں پنڈال پر بیٹھ گئے۔

”لمبی داڑھی والے نے قرآن کریم کی آیت پڑھتے ہوئے سامنے مجمع کی طرف دیکھا۔ کیڑوں کا ایک بڑا سا ڈھیر چھوٹی چھوٹی ڈھیروں میں بنا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ بھیڑیں سر جھکائے ادھر ادھر سرک رہی تھیں۔ گویا پناہ مانگ رہی ہوں۔ اس نے نگاہ اٹھائی سامنے اس بیٹھے سے ٹیلے پر ڈھیریاں بکھری پڑی تھیں۔ رنگ رہی تھیں۔ جیسے ان درختوں کی پناہ میں آجانے کی خواہاں ہوں اور درخت شاخیں پھیلانے کھڑے تھے۔ کسی جذبہ سے مسحور ہو کر وہ جلال میں بولا۔ ”اے مسلمانو! اے مردہ مسلمانو! تم۔۔۔ تم اس ملت کے افراد ہو جو کسی زمانے میں دنیا بھر کے لئے پیام حیات بن کر آئی تھی۔ لیکن آج تم۔۔۔۔۔ مردہ بھیڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔“

اس نے تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اور پھر جلال میں آہم کھنکھارا ”ہم“

”آواز گونجی اور وہ اطمینان سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے تم اور ہم کا فرق واضح کر چکا ہو۔

”بھیڑوں سے بڑھکر حیثیت نہیں رکھتے۔“ اس نے دہرایا۔

معاً اچکن والے نے محسوس کیا گویا اس کے ہاتھ میں چھڑی کی جگہ عصا تھا۔

”آج تم ایک مردہ قوم ہو۔ اپنے اپنے نفوس میں مدفون۔ آج تم محض مٹی کی ڈھیریاں ہو۔ قبروں کی سی ڈھیریاں اُس نے ایک منظر ٹیلے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ان مزاروں پر بھی روشنی کے بگولوں نے یورش کر رکھی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت! وہ ٹیلے کی طرف اٹھا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دیکھو ٹیلے کی قبریں بگولوں کی زد میں آئی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن وہ درخت۔۔۔۔۔ وہ درخت۔۔۔۔۔ بوڑھے ہو چکے ہیں پتے جھڑ گئے ہیں پسلیاں نکل آئی ہیں۔“ اچکن والے نے اپنی چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن وہ درخت۔ اللہ کی رحمت کی طرح اپنی شاخیں پھیلانے قبروں کو پناہ دے رہے ہیں۔ وہ دیکھو“ اس نے از سر نو ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور دونوں ہاتھ ٹہنیوں کی طرح پھیلا دیئے۔

معاً اس کے دونوں ساتھی اٹھ بیٹھے ”خاموش“ منڈی ہوئی داڑھی والا اپنا سوجنا ہجوم کے سر پر کھڑا کر کے چلایا۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ تراشی ہوئی داڑھی والے نے اپنا ہاتھ اور چھڑی پھیلاتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں ہاتھ پھیلائے اس ٹیلے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں تین درخت ٹہنیاں پھیلائے کھڑے تھے۔ پنڈال تلے ان تینوں کے زیر سایہ بھیڑیں مٹی کی ڈھیروں کی طرح دہکی بیٹھی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ابھی تمہاری محافظ ہے“ لمبی داڑھی والا جلال میں بولا۔ ”لیکن تم اپنے نفوس میں مدفون ہو۔ تم۔۔۔۔۔ اہم۔۔۔۔۔ اس نے کلا صاف کیا۔ ہم۔۔۔۔۔“ ویرانے نے تسخر بھری آواز میں جواب دیا۔

لیکن وہ تینوں بائیں پھیلائے کھڑے رہے اور بھیڑیں رینگتی رہیں۔

پاگل

میں پاگل ہوں۔ میرا پاگل پنا صرف اس لئے ہے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے۔ اب میں جان گئی محبت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں۔ ہاں۔ پاگل بنا دینا یا بن جانا۔ کاش میں خود پاگل نہ بنتی۔ لیکن اب پچھتانے سے حاصل۔ وقت بیت چکا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔

کون ہے جو میری کہانی سے واقف نہیں۔ میں وہ بد نصیب عورت ہوں جو دنیا بھر میں بدنام ہے۔ جسے دیکھ کر کہنیاں چلتی ہیں۔ اٹکیاں اٹھتی ہیں۔ آنکھوں میں عریاں اشارے جھلکتے ہیں۔ لوگ دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ تسنؤ بھری مسکراہٹ وہ یوں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ گویا میں دنیا کی حسین ترین عورت ہوں۔ جھوٹ ہے! سراسر جھوٹ!! میں ایک دہلی ہتلی اداس عورت ہوں اور بس گورا رنگ حسن نہیں ہوتا۔ توتے ہوئے لمبے چہرے کو خوبصورتی سے کیا تعلق۔ البتہ میری آنکھ۔ لیکن نہیں ان آنکھوں میں اداسی اور بے بسی کے سوا کیا ہے شوخی نہیں۔ چمک نہیں غار نہیں تبسم نہیں۔ پھر ان کی ہچکچاہٹیں میری آنکھوں کو تلاش کیوں کرتی ہیں۔۔۔۔۔ کیوں؟ ان چھلکی ہوئی کٹوریوں میں غم کے سوا کیا ہے۔ پھر بھی انہیں چھپا چھپا کر رکھتی ہوں۔ شکر ہے کہ میری پلکیں اتنی لابی ہیں۔ شاید میرے ان بچے۔ آنسو بال بن کر آگ آئے ہیں۔ لیکن لوگ کسی صورت چین نہیں لینے دیتے۔ پلکیں اٹھا کر دیکھوں تو یوں ٹھٹھکے جاتے ہیں، جیسے سدھ بدھ نہ رہی ہو۔ پلکوں سے ڈھانپے رکھوں تو یوں جھانکتے ہیں گویا میں چغتائی کا عمل ہوں۔ آوازے کتے ہیں۔۔۔۔۔ اُف ان کی وہ عریاں باتیں۔ تنگی نکاہیں۔۔۔۔۔ وہ مجھے ایسی عورت سمجھتے ہیں جس کے بارے میں جو جی چاہے جہاں جی چاہے کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ سب اس دیوانے رضا کی مہربانی ہے۔۔۔۔۔ وہ ہوشیار دیوانہ۔۔۔۔۔ اُف اس کی گھناؤنی

شکل۔ سو جا ہوا چہرہ۔ اور خاموش وحشت بھری نکاہیں۔ میں جاتی ہوں وہ دیوانہ نہیں۔ دیوانگی کے پردے میں مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ اُف کس قدر خوفناک انتقام ہے اس کا۔ ہوس کار فریبی!! کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ میں نے اُس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اپنا شریک حیات آپ چُٹنے کا مجھے حق نہیں کیا؟

ہاں اسے مجھ سے محبت تھی۔ یہ بھی مانتی ہوں کہ میں نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کیا مجھے اپنی رائے بدلنے کا حق حاصل نہیں؟ اگر مجھے وعدہ کرنے کا اختیار ہے تو اسے توڑنے کا کیوں نہیں؟ اور۔ کیا وہ وعدہ میں نے توڑا تھا۔ میں!! میری حقیقت ہی کیا ہے۔ حالات کے ہاتھوں میں کٹ پتلی! یہ حالات جن سے میں گذر رہی ہوں۔ کیا یہ میرے بنائے ہوئے ہیں۔ اُف یہ حالات!! یہ بھوکی نکاہیں۔ چلتی ہوئی کہنیاں۔ جیسے لوگوں کو مجھے گھورنے کے سوا کوئی کام ہی نہ ہو۔ جیسے بھوک سے بلبلائے وحشی مردوں کے جہاں میں صرف میں ہی ایک عورت ہوں۔

کیسے اچھے تھے وہ دن جب میں لاہور کی بھیڑ میں تنہا تھی۔ جب میں بے فکر جہاں جی چاہے بھاگی دوڑی پھرتی تھی۔ کوئی میری طرف گھورتا نہ تھا۔ سرسری نکاہیں اور بس۔ پھر میں اور رضا اٹھے سیر کرنے لگے۔ لیکن کوئی ہمارے اٹھے گھومنے پر معترض نہ تھا۔ ان دنوں لوگ ہماری راہ سے ہٹ کر اپنی راہ ناپا کرتے تھے۔ ان دنوں بھی تو میں میں تھی۔ یہی میں۔ یہی رنگ۔ یہی آنکھیں۔ پھر۔۔۔۔۔ آہ!! ان دنوں میری زندگی میری اپنی زندگی تھی۔ لیکن اب۔ اب وہ گویا عوام کی ملکیت بن چکی ہے۔ لیکن کیوں؟۔۔۔۔۔ ہر راہ گیر مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے وہ میرا راز جانتا ہو۔ جیسے میں ان کے ہاتھ کا کھلونا ہوں۔ جیسے میں ان کے ایک اشارے کی منتظر بیٹھی ہوں۔ گویا میں نے صرف دکھاوے کے لئے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ جیسے وہ نکاہوں سے میرے کپڑے۔۔۔ اُف!! میں سمجھتی ہوں میری حالت ان عورتوں سے بدتر ہے۔ جو علانیہ طور پر لالچین جلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ لوگ انہیں گھورتے ہیں جانچتے ہیں۔ پرکھتے ہیں۔ لیکن ان کی نکاہیں ان کے کپڑوں میں دھنسنے کی

کوشش نہیں کرتیں۔ جیسے۔ جیسے کوئی پلپلا گھناؤنا کیرنگ رینگ کر سوراخ کر رہا ہو۔ لوگ انہیں دیکھ کر راز افشا کرنے کی خاموش دھمکی نہیں دیتے۔ سودا کرتے ہیں۔ ناک چڑھا لیتے ہیں یا منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔

ہاں میری حالت اخلاق سے گری ہوئی ان عورتوں۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔ کون جانتا ہے کن حالات نے گھسیٹ کر انہیں وہاں لا بٹھایا ہے۔۔۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے۔ نہ جانے میں۔۔۔۔۔ لیکن نہیں میں آپ سے کچھ نہ چھپاؤں گی۔۔۔۔۔ چھپانا؟ میں اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے رہی ہوں۔ کہ میرے پاس اب بھی چھپانے کو کچھ باقی ہے۔ جھوٹی تسلی میں تسلیم کرتی ہوں کہ بارہا میرا جی چاہا کہ میں لالٹین جلا کر بیٹھ جاؤں۔ اور اپنے آپ کو ان عریاں اشاروں اور ٹکاپوں سے محفوظ کر لوں ان دھنس جانے والی ٹٹولتی ہوئی نظروں کی زد سے بچ جاؤں۔ ایسا کرنے سے جسم روندنا جائے گا۔ روح تو بچ جائے گی۔ اب وہ میری روح کو لتاڑ رہے ہیں۔۔۔ لیکن مجھ میں جرأت بھی ہو۔ ہاتھ کا کھلونا بننے لے جرأت ہوئی چاہیے اور مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ برقعہ پہن لیتی۔ ڈرتی رہی کہ لوگ کہیں گے۔ غیر مسلم ہو کر برقعہ پہنتی ہے۔ ڈرتی رہی کہ مزید چرچا ہو گا۔ فقرے کسے جائیں گے۔ پہن لیتی۔ تو نہ جانے وہ دیوانہ کیا کرتا۔ لوگ ٹکاپوں سے نوچ لیتے۔ دھجیاں اڑا دیتے جب تنگ منہ کی بے غائش عمومیت مجھے چھپا نہ سکی تو پردہ کیا چھپا سکتا تھا۔ وہ پردا جس کی اوٹ لے کر ایک عام عورت بھی حسین بن سکتی ہے اور راہ چلتے لوگوں کے لئے سہکار کئے ہوئے

چہرے سے زیادہ پر جوش دعوت بن جاتی ہے۔ خیر اب تو میں بڑی حد تک اس جیتی جاگتی بدنہی سے بے نیاز ہو چکی ہوں۔ جو قدرت نے میرے ماتھے میں کیل بنا کر ٹھونک رکھی ہے۔ لیکن جب سوچتی ہوں۔ کہ میں نے کیا سہا ہے تو دل پر ٹھیس لگتی ہے۔ بچ۔ بچ۔ سمٹ سمٹ کر جھکی جھکی آنکھوں سے چلنے کے باوجود میں یوں محسوس کیا کرتی گویا زمین کی بجائے ٹکاپوں پر پھسل رہی ہوں۔ ٹکاپوں کا تانتا بند جاتا۔ ایک تار ٹوٹنے سے پیشتر دوسرا بندھ جاتا۔ ایک دھنس کر دیکھتا۔ دوسرا مسکرا مسکرا کر برماتا۔ تیسرا کلیڈ آئی کی جونک لگا دیتا۔ ہونٹ جلتے۔ آواز سے کسے

جانتے۔ ”وہ ہے۔۔۔۔۔“ ”وہ۔۔۔۔۔“ ”دیکھا۔۔۔۔۔“ ”اے جانتے ہو۔۔۔۔۔“ ”بانگی ہے بانگی۔۔۔۔۔“ ”کلیوں میں دروازے کھلتے۔۔۔۔۔“ ”اچھا۔۔۔۔۔“ ”یہ ہے وہ۔۔۔۔۔“ ”ہائے ری یہ کافرہ۔۔۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔۔۔“ ”ہاں یہی۔۔۔۔۔“ ”کوئی مسکراتا۔۔۔۔۔“ ”کوئی ناک چڑھاتا۔۔۔۔۔“ ”عورتیں ہونٹوں پر اٹھکی رکھ کر حیران کھڑی ہو جاتیں۔۔۔۔۔“ ”آپ چاہے کسی سے آنکھیں لٹکائے ہوئے ہوں۔ لیکن مجھے دیکھ کر ہاتھ کانوں پر رکھ لیتیں جیسے ابھی ابھی حج کر کے آئی ہوں مجھے دیکھ کر ناک سکڑ لیتیں اور پھر میاں یا دیوار کی طرف دیکھ کر مسکراتیں تنگی مسکراہٹ۔۔۔۔۔“ ”برہنہ دعوت۔۔۔۔۔“ ”بھوکے ساتھی کے ہونٹ لیسدار جونک کی طرح ٹٹک آتے اور ہوس سے اندھے گوشت کے لوتھڑے قریب ہی کچھ ڈھونڈنے لگتے۔۔۔۔۔“ ”یہ ہیں وہ لوگ جو مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ کوئی استقامی جوش سے بھرا ہوا مرد میری محبت میں دیوانہ ہو جانے کا ڈھونگ رچائے بیٹھا ہے۔ گلی کوچوں میں میرے نام کے نعرے لگاتا پھرتا ہے۔ دیوانہ ہونے کے باوجود اس قدر ہوشیار ہے کہ ہر سے عشق پہچاں کا پھول اٹھائے اس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ میرا نام ”آئی وی“ ہے نا اس لئے۔ دیوانہ ہونے کے باوجود مجھ سے عشق کرنے کے دعوے کو نہیں بھلا سکا۔ اتنا نہیں بھولتا کہ میں کس راہ سے ہسپتال جاتی ہوں۔ وہ دیوانہ جو جگہ جگہ میرے پیچھے سایہ کی طرح لگا رہتا ہے۔ شہر شہر میرا پیچھا کرتا ہے۔ مجھے اس کی ہوشیاری اور ضد پر حیرانی ہوتی ہے۔ اُف وہ ہوشیار دیوانہ جس کا وجود محبت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں میں اس کی دیوانگی کا باعث ہوں۔ اُف یہ لوگ اور ان کی باتیں وہ اس خبطی کو عشق کا پیغامبر سمجھتے ہیں۔ اس کی ہر حرکت ان کی نگاہ میں محبت اور وفا کا مرقع ہے۔ وہ میری ہر بات سے بے وفائی اور ستم کیشی اخذ کرتے ہیں۔ اور پھر ان اخذ کی ہوئی تفصیلات کو اپنی خواہشات کے مطابق ترتیب دے کر خوش ہوتے ہیں۔ یہاں سے کاٹ چھانٹ کی، وہاں بڑھایا چڑھایا تاکہ کہانی سنسنی خیز ہو جائے انہیں سنسنی پیدا کرنے سے لطف آتا ہے۔ ان کی سن سن کر میں آپ اپنے قصے کی حقیقت پر شک کرنے لگی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا، آیا میری بات سچی ہے یا وہ جو زبان زد خلق ہے۔ لیکن ایک بات زبان زد خلق

ہو۔ تو بھی سمجھ میں آئے۔ ہر کوئی اُسے یوں ترتیب دینے پر تلا ہوا ہے۔
 کہ رضا کی محبت بلند تر دکھائی دے۔ اس کی دیوانگی قربانی نظر آئے اور میری
 خاموشی بے حسی ظلم اور نہ جانے کیا۔ بات یوں ڈھالی جاتی ہے۔ جس سے ظاہر
 ہو کہ مجھ سے بڑی فاحشہ کوئی نہیں۔ ابھی تک مجھ میں تمیز باقی ہے۔ چھوٹی
 موٹی تفصیلات تو خلط ملط ہو چکی ہیں۔ لیکن اہم تفصیلات یاد ہیں مجھے۔
 آپ رضا کو نہیں جانتے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ دیوانہ رضا ہے تو آپ کی
 بھول ہے۔ وہ رضا کچھ اور تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ جب میں نے اسے پہلی
 مرتبہ دیکھا۔ اس روز میری ڈیوٹی ڈی وارڈ میں لگی ہوئی تھی۔ نامٹ ڈیوٹی۔
 دس کے قریب وہاں پہنچی۔ اور حسب معمول راؤنڈ کرنے لگی۔ وہ مجھے دیکھ
 کر چوٹکا۔ اور پھر ٹانگی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اکثر
 مریض ہمیں دیکھ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے اس فانی دنیا میں
 کوئی غیر فانی مخلوق کو دیکھ کر اوسان کھو رہا ہو۔ لیکن اس کے باوجود رضا کا انداز
 ٹرالا تھا۔ اس کی نگاہ میں بناوٹ کی بجائے بے ساختگی کی جھلک تھی۔ شاید اسی
 وجہ سے میں جھینپ گئی۔ میں نے جلدی سے اس کا ٹکٹ دیکھا اور دوائی بنا
 کر لے آئی۔ دوائی پیتے ہوئے بھی وہ میری طرف تکتا رہا۔

اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ جو کھیل کے میدان میں ٹوٹی تھی۔
 اس کے سوا اُسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ چوکور چہرہ۔ سانولا رنگ کشادہ پیشانی پر
 کنڈل دار بال اور مست آنکھیں۔ جن پر گہری بھوس تھی ہوئی تھیں۔ نہ جانے
 انہیں دیکھ کر یہ احساس کیوں ہوتا کہ کوئی سانپ کنڈلی مار کر بیٹھا ہے۔ شاید
 اس لئے کہ ان بھوسوں میں بلا کا اضطراب تھا۔ راؤنڈ کے بعد میں اپنی نشست پر
 آ بیٹھی۔ اسے دیکھے بغیر میں محسوس کر رہی تھی۔ کہ وہ میری طرف دیکھ رہا
 ہے۔ اس احساس کی وجہ سے یا نہ جانے کیوں میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے آنکھ پچا کر ادھر دیکھا۔ اس کی ٹانگیں
 میرے منہ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھیں جھکالیں۔ اور یوں بیٹھ رہی۔
 جیسے کوئی شدت سے کام میں مصروف ہو۔ لیکن آخر کب تک یوں بیٹھ رہتی۔

تمام مریض سو گئے یا چپ چاپ پڑ رہے۔ وارڈ کے پرلے سرے پر دو ایک گمراہ
 رہے تھے۔ لیکن وہ گردن موڑے میری طرف تک رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔
 نیند نہیں آتی تمہیں۔ میں نے پاس جا کر اسے کہا۔ وہ چوٹکا۔ تمہیں آرام کی
 ضرورت ہے نا۔ میں نے لپرواہی سے سرسری طور پر کہا۔ میں بڑے مزے
 میں ہوں۔ وہ مسکرایا۔ لیکن اس طرح صحت پر برا اثر پڑے گا۔
 ”صحت۔۔۔۔۔ تمہاری قسم میں تو چینی لگا ہوں۔ کب سے مردوں کی طرح پڑا
 تھا۔ مگر اب۔۔۔۔۔“

دو ایک دن تو میں نے کوشش کی کہ رضا سے بے نیاز رہوں۔ لیکن میں
 کیا کرتی۔ ساری ساری رات وہ میری طرف تکتا رہتا۔ حتیٰ کہ اس احساس کی وجہ
 سے مجھے کام میں مشغول دکھائی دینا مشکل ہو گیا۔ پہلے پہل میں بہانے بہانے
 سارے وارڈ میں پھرا کرتی تھی۔ لیکن دو ہی دن میں مجھے ادھر ادھر جان دو بھر
 دکھائی دینے لگا۔ جلدی جلدی جاتی اور پھر کام ختم کر کے واپس آ جاتی۔ نہ جانے
 کیوں میں نے کرسی کو بھی ایسے مقام پر سرکا لیا تھا۔ جہاں سے وہ میرا سارا
 چہرہ دیکھ سکے۔ بہت جلد ہم اچھے خاصے دوست بن گئے۔ اس کا بات کرنے
 کا انداز انوکھا تھا۔ تکلف سے عاری۔ بات کرتے ہوئے جھجکتا بھی نہ تھا۔ اس
 کے علاوہ اظہار محبت کے سوا اسے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ ہر بات میرے
 ذکر پر ختم ہوتی۔ پوچھتی ہوں۔ آپ کو چوٹ کیسے آئی۔ جواب ممتا ہے۔
 ”کیوں نہ آتی چوٹ نہ آتی تو تم سے کیسے ملتا۔“ لیکن اس روز جب اس نے سنا
 کہ میں دوسرے وارڈ میں لگنے والی ہوں۔ تو نہ جانے اسے کیا ہوا۔ ایک
 ساعت کے لئے اس کا منہ لال ہو گیا۔ ”بس اتنی سی بات پر“ میں نے ازراہ
 مذاق کہا۔ ”اتنی سی بات!“ وہ ہنسا۔ اف وہ ہنسی۔ اسی کی ہنسی میں دیوانگی
 کی جھلک تھی۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ جی چاہا ادھر ادھر ہو جاؤں۔ ”اتنی سی
 بات!“ وہ پھر ہنسا۔

نہ جانے کیوں اتنی سی بات پر میں کیوں اس قدر پریشان ہو گئی۔ نتیجہ یہ
 ہوا۔ کہ میں نے اپنی ڈیوٹی بدل لی۔ یہ میری غلطی تھی۔ اگر میں اپنی ڈیوٹی
 پہنچنے نہ کرتی تو حالات نہ بگڑتے۔

چند ہی دنوں میں وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اصل میں اس کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ اس سے ہاتھ ملنا ممکن نہ تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ چند ہی باتوں میں وہ دوسرے کو مانوس کر لیتا۔ اس کی ہر بات گھونگھٹ اٹھا دینے والی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ امید نہ تھی۔ کہ وہ ایسی جلدی مجھے شادی کا پیغام دے دے گا۔ آپ جانتے ہیں۔ نرس کی ڈیوٹی دوا پلانے اور پٹی کرنے تک محدود نہیں ہوتی۔ ہمیں ہر مریض کا دل بہلانا پڑتا ہے۔ ہماری حیثیت مریض کے ہاتھ کے کھلونے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تو میں رضا کا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتی لیکن مجھے یہ وہم بھی نہ تھا۔ کہ میری ہر بات کسی ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا ہو رہی ہے۔ مجھے واضح طور پر شعور نہ تھا۔ کہ میری باتوں میں محبت کی جھلک ہے۔ ہر مریض نرس سے اظہار محبت کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ نہ جانے کیوں نرس، کو محبت بھری نگاہ سے دیکھنا اس پر عاید ہو جاتا ہے۔ چاہے جان جسم سے نکل کر ہوشوں پر انگلی ہوئی ہو۔ نہ جانے اس وقت وہ اس دنیے کی طرح مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں۔ جس کا تیل ختم ہو چکا ہو۔

اس وقت لیٹا ہوا وہ ٹنگی باندھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میں اس کے ٹکٹ پر اندراج کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بلایا اور پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں سرسری طور پر اس کے پلنگ پر جھکی۔ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ بولا ”ایک بات پوچھوں“۔ ہاں ہاں میں نے لہرواہی سے کہا۔ اس نے بلا تکلف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کہنے لگا۔ ”مجھ سے شادی کرو گی۔ آئی وی“ میں چونک پڑی لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال کر مذاق سے بولی۔ ”شادی؟“ ”ہاں“۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ ”اور اگر میں ”نہ“ کہہ دوں تو؟“ میں نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی تو۔۔۔۔۔۔ تو وہ پریشان ہو گیا۔ جیسے یہ امکان اس کے خواب و خیال میں ہی نہ تھا۔ ”تو نہ جانے کیا ہو جائے“۔ وہ گنگنایا۔ کیا ہو گا میں مسکرائی ”کیا ہو گا“۔ اس نے ارد گرد دیکھ کر کہا۔ یہ بتیاں مجھ جاچیں گی۔ اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ ”وہ چاند ٹوٹ کر نیچے گر پڑے گا۔ تارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گل ہو جائیں گے۔ اور یہ دنیا۔۔۔۔۔۔“

بہت کچھ ہو گا پھر تو“۔ میں ہنسی۔ ”ہاں“ اس کا چہرہ اور سنجیدہ ہو گیا۔ بھوس سکڑیں۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ مذاق نہ سمجھو آئی وی۔ مذاق میں اڑاؤ“۔ میں اس کے سنجیدہ اور وحشیانہ انداز کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ ”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ مجھے سوچنے دو“ ”اچھا“ وہ تیوری چڑھا کر بولا ”انکار نہ کرنا ورنہ۔۔۔۔۔۔“ اس کا انداز دیکھ کر میں کانپ گئی۔ ”جوش میں نہ آؤ مسٹر رضا ٹانگ ہل جائے گی“۔ ٹانگ ”وہ چلتا“ اگر یہ ٹانگ تمہارے اور میرے درمیان حائل ہے۔ تو تمہاری قسم میں اسے اکھاڑ کر پھینک دوں گا“۔

اس دن سے مجھے رضا سے ڈر آنے لگا۔ اس کے جوش اور شوق کی شدت کو دیکھ کر میں سہم جاتی۔ اس کی تپتی ہوئی گھنٹی بھوس یوں ابھرتی جیسے طوفان میں گرداب اٹھ رہے ہوں۔ اس سے میل ملاپ بند کر لینے کی ہمت نہ تھی۔ سو بات بڑھ گئی۔ اس کی توقعات بڑھ گئیں۔ اس کی نکالیں میرے لئے مخصوص ہو گئیں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ صرف میرے لئے جیتا تھا۔ صرف میرے لئے۔ جس قدر ڈرتی اسی قدر اسے جھٹلانا مشکل ہوتا جاتا۔ میری خاموشی اس کی توقعات کو ہوا دیتی۔ خوف کے باوجود یا شاید اسی لئے میرا دھیان اس کی طرف لگا رہتا۔ جیسے کبوتری شکاری کی بندوق کو دیکھ کر دہشت سے بے حس و حرکت بیٹھتی اسے ٹنگی باندھ کر دیکھنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جلد ہی وہ دن آ گیا۔ جب وہ خود چلتا ہوا میرے گھر آیا۔ وہ پہلا دن تھا۔ جب ہمارے تعلقات میں مریض اور نرس کی سی بات نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس نے خود کو فریب دے دے کر اپنے آپ کو مریض بنا رکھا تھا۔ ایسا مریض جس کی صحت کا دارومدار مجھ پر تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے اس کے نزدیک نرس بن چکی تھی۔ میرے گھر وہ صرف دو ایک مرتبہ آیا۔ اس کے بعد مجبوراً مجھے حقیقت کا اظہار کرنا پڑا۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی۔ کہ اسے انکار کے لئے تیار کر دوں۔ لیکن اب ان تفصیلات سے فائدہ؟

انکار سن کر وہ ایک زخمی پرندے کی طرح مڑپا۔ اس کی بھوس سمٹیں منہ سرخ ہو گیا۔ پھر دفعتاً اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ کرخت اور بھیانک قہقہہ۔

اس کے بعد ہر روز ہسپتال جاتے ہوئے راہ میں کہیں نہ کہیں وہ قہقہہ گونجتا۔ وہی کھوکھی آواز جس میں تمسخر اور طنز بھرا ہوتا۔ جیسے دور۔ دور کوئی بدروح اس دنیا کی جھوٹی مضحکہ خیز باتوں پر تمسخر اڑا رہا ہو۔ پھر وہ قہقہہ ہمارے ہسپتال کی دیواروں میں سے سنے لگا اور بالآخر میرے مکان کے گرد امنڈ آیا۔ ایک دن جب میں کھڑکی میں کھڑی نہ جانے کس سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ گلی کی نلکڑ پر کھڑا تھا۔ سو جا ہوا منہ اکڑی ہوئی بھوس۔ بلوری پھٹی پھٹی آنکھیں۔۔۔۔۔ اُف وہ منظر!! میں نے ڈر اور نفرت بھری پھریری محسوس کی اور جھجک کر پیچھے ہٹی۔۔۔۔۔ پھر وہی قہقہہ۔ اف وہ کھڑا ہنس رہا تھا۔ چہرے کے خطوط یوں ابھر سمٹ رہے تھے۔ جیسے جانکنی کے عذاب میں مبتلا ہو۔ بعد مشکل میں نے اپنے آپ کو اس منظر سے علیحدہ کیا۔ اور دھڑام سے چارپائی پر آگری۔

اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ ہر جگہ وہی قہقہہ گونجنے لگا۔ حتیٰ کہ تمام دنیا اس کی گونج کی لپیٹ میں آگئی۔ پھر حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ وہ میرے مکان تلے کھڑا میرا نام لے لے کر پکارتا۔ چیختا۔ قہقہہ مار کر ہنستا۔ میرے نام کا نعرہ گلی کوچوں میں گونجنے لگا۔ ہسپتال کی دیواریں آئی۔ وی آئی۔ وی کی صداؤں سے گونجنے لگیں۔ باغ کی روشیں۔ سڑکیں۔ بازار۔ اف!! لوگ میری طرف گھورنے لگے۔ مسکرانے لگے۔ کہنیاں چلیں۔ آنکھیں چمکیں۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

ان حالات نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ میں زخمی پرندے کی طرح تڑپتی دیک کر کونوں کی طرف کھسک جاتی۔ میری پلکیں اور بھی جھک جاتیں۔ میرا جسم سمٹ کر معدوم ہونا چاہتا۔۔۔۔۔ لیکن بے سود!! میں نے مکان بدلے ہسپتال بدلے ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے میں چلی گئی۔ لیکن وہ دیوانہ ہر جگہ جا پہنچتا۔ ہر جگہ وہ میرا مکان ڈھونڈ لیتا۔ اور ایک روز میں دیکھتی کہ وہ میری وہلیز پر بیٹھا ہاتھ میں آئی۔ وی کا پھول لئے اس سے باتیں کر رہا ہے۔ ہر نئے شہر میں نئے سرے سے چرچا ہوتا۔ نئے جوش سے باتیں ہوتیں۔ نئی ہکابیں۔۔۔۔۔ اف! اب میں نے شہر بدلنے کا خبط چھوڑ دیا ہے۔ کیا

فائدہ۔

انہیں دنوں مسٹر ظہیر مجھ سے ملے وہ پہلے شخص تھے جنہیں مجھ سے ہمدردی تھی۔ ورنہ لوگ تو مجھے ڈائن سمجھتے تھے۔ وہ ڈائن جس نے جس نے اپنے جادو سے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور اپنے اس شہکار پر نازاں تھی۔ نہ جانے لوگوں کو دیوانوں سے ہمدردی کیوں ہوتی ہے۔ ان کی بر بات میں نکتہ پیدا کر لیا جاتا ہے۔

میں سمجھتی ہوں لوگوں کو انوکھے واقعات سے عشق ہے۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ عشق و محبت کی کوئی کہانی معمولی واقعات سے بنی ہو۔ اس لئے وہ ہر آپ بیتی میں انوکھے پن کا رنگ بھرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ زبان زد خلق ہو کر جاری کہانی میں کیا کیا رنگ نہ بھرے گئے۔ نئی انوکھی تفصیلات جوڑی گئیں۔ رضا کی قربانیاں میرے ظلم حتیٰ کہ ہر قصہ ایک عجیب سا قصہ بن گیا۔ ایک ان سنا قصہ اب تو بارہا مجھے خود شک پڑ جاتا ہے۔ کہ شاید وہ قصہ صحیح ہے۔ مجھے اپنی یادداشت پر اعتبار نہیں رہا۔ ہاں تو ظہیر پہلا شخص تھا۔ جس سے دلی ہمدردی تھی۔ اس کے دل میں اس دیوانے کے خلاف بغض تھا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار اس کے منہ سے بھی ایسی بات نکل جاتی جس سے غصہ ہوتا۔ کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں رضا کی مظلومیت اور میری بے وفائی کے تاثرات دبے ہوئے ہیں۔ میں سن کر چونک پڑتی۔ دھک سے میرے سینے میں کچھ ڈولنے لگتا گرد و پیش دھندلا جائے۔ مثلاً اس روز وہ ازارہ مذاق بولا۔ ”وہ دیوانہ سچا ہے۔ آئی۔ وی تمہارا انداز ہی کچھ ایسا ہے۔ کہ پاگل ہوئے بنا رہا نہیں جانتا“ ”کیوں“۔ میں چڑکئی ”میں کیا بے وفا ہوں“۔ ”نہیں“۔ وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ ”بے وفا نہیں لیکن تمہاری وفا بذات خود دیوانہ کن ہے“۔ پھر وہ ہنس پڑا لیکن یہ بات میرے دل پر پتھر کی لکیر بن گئی۔ میں ایک حساس لڑکی ہوں۔ بات میرے دل میں کھب کر مجھے غم کی اتھل پھرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ اور میں یوں محسوس کرنے لگتی ہوں۔ جیسے نشے میں ہوں۔ سدھ بدھ نہیں رہتی۔۔۔۔۔ ہاں

رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس روز میں نے محسوس کیا۔ جیسے میں کسی ویرانے میں چل پھر رہی تھی۔ کسی وسیع کائنات میں حقیر کیڑے کی طرح رہینگ رہی تھی۔

اس دھندلے میں میں نے سنا وہ مر گیا۔ میں نے ایک دھچکا محسوس کیا۔ میری دنیا ڈولی۔ نہ جانے کیوں بارہا میں نے دعائیں مانگی تھیں کہ وہ مر جائے میرے ماتھے سے بدنای کا ٹیکا مٹ جائے میں سمجھتی تھی اس کے مرنے پر مجھے مسرت ہوگی۔ میں آزاد ہو جاؤنگی دنیا میرے لئے اس قدر وسیع ہو جائے گی۔ جیسے کسی زمانے میں تھی۔ لیکن انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ کو مجھے اُس کی موت پر غم نہ ہوا۔ لیکن خوشی بھی نہ ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں سمٹ کر معدوم ہو گئی ہوں۔ اور ارد گرد کی اشیاء ابھر کر بلند ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ اس قدر پھیل گئیں کہ میں ان میں دفن ہو کر رہ گئی۔ دفعتاً دنیا نے انگڑائی لی اور میں سمٹی۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے میں دیوؤں کے ملک میں ایک بالستیا تھی۔

اسی شام کو ظہیر آیا نہ جانے وہ اس قدر مضطرب کیوں تھا، بولا۔ ”میں چاہتا ہوں آئی۔ وی۔۔ میں چاہتا ہوں جلد ہماری شادی ہو جائے“۔ نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھ سے مذاق کر رہا ہو۔ شاید چھیڑنے کی غرض سے میں نے کہا ”اور اگر نہ ہو سکے تو۔۔۔“ معاً اس کا چہرہ غصے یا نہ جانے کس بات سے سوچ گیا۔ اف وہ چہرہ! مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے رضا دوبارہ جنم لے رہا ہے۔ ”تم چاہتی ہو میں بھی پاگل ہو جاؤں“۔ وہ چلایا میرے دل میں ایک وحشت بھرا جذبہ کھولنے لگا۔ میں ہنسی۔ دیوانہ وار ہنسی۔ اس کا چہرہ اور بھی بھینک ہوتا گیا۔ میں اٹھ بیٹھی میری منظر کشی سے باہر تھی۔ وہ وسیع پھیلاؤ سمٹنے لگا۔ لوگ کبڑے ہوتے گئے۔ بالستیوں کے ملک میں کوئی گھیور اکھڑا ہوا۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ دیوانی ہوں۔ ان حالات میں ظہیر کی زندگی برباد کرنا۔ ”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا“۔ میں چلائی ”یہ کبھی نہ ہوگا۔“ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی خوشی ظہیر کے لئے قربانی کر رہی ہوں۔ وہ جوں کا توں کھڑا تھا۔ آنکھوں کی چمک بچھ گئی تھی۔ منہ سوچ گیا

اور چہرے پر وحشت چھا گئی تھی۔۔۔ شاید یہ میری آنکھوں کا دھوکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کا کوئی حصہ تڑپ تڑپ کر مر رہا ہے۔ لیکن مجھے تسکین تھی۔ کہ میں نے اپنے محبوب کو ایک دیوانی سے محفوظ کر لیا ہے۔ مجھے اپنا خیال نہیں۔۔۔۔۔ میرا کیا ہے۔۔۔۔۔ اپنے آپ کو محبوب کے لئے قربان کر دینا، کیا یہ محبت کی انتہا نہیں۔۔۔۔۔؟ لیکن لوگ!! وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے۔۔۔۔۔ نہ سمجھیں! مجھے اس سے کیا۔۔۔۔۔؟

ہاں میں پاگل ہوں۔ میرا پاگل پن صرف اسی لئے ہے کہ مجھے ظہیر سے محبت ہے۔ اب میں نے جان لیا کہ محبت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں۔ پاگل بنا دینا یا بن جانا۔ کاش میں خود پاگل نہ بنتی!! لیکن اب ہچکھتا نے سے حاصل!!

ٹھیک ہو جائے گا۔ سب۔“

میں نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے بس چمک کو دیکھ کر میں نے کیوں ایسا محسوس کیا گویا کسی کال کو ٹھڑی میں کوئی دروازہ کھلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شدت احساس سے میں اٹھ بیٹھا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ خوشی سے چمانے لگے۔ ”ہاں ہاں کھول دیجئے بہت مہربانی ہے۔ بڑا اچھا کیا آپ نے۔“ اور پھر مجھے کھڑکی کی طرف جاتے دیکھ کر بڑبڑانے لگے۔ ”اچھا تو یہ بھی سہی۔ بڑی اچھی بات ہے مہربانی ہے۔ بڑا اچھا ہوا۔ بڑا اچھا ہوا آپ آگئے۔ اچھا تو میں چائے۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ رینا۔ وہ نہیں آئے گا۔“ ان کی نگاہ میں یوں حسرت جھلکی گویا وہ رینا کے نہ آنے کے خلاف مجھ سے اپیل کر رہے ہوں۔ گویا رینا کے نہ آنے سے پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ پھر اس گہری نیلگوں جھیل میں ایک طوفان جھولنے لگا۔ اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ”اچھا تو میں ہو آؤں مجھے جانا ہی ہو گا۔ آپ بیٹھیں مجھے جانا ہے۔ میں ہو آؤں ذرا۔“ انہوں نے گویا مجھ سے اپیل کی۔ ”پرکاش بیٹے! تم مسٹر۔۔۔۔۔۔ مسٹر۔۔۔۔۔۔ کے لئے چائے بنوا لینا۔ میں ہو آؤں۔“

”جی، چچا جی میں بلراج کے لئے چائے بنوا لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ پرکاش نے کہا۔

”ہاں، ہاں“ وہ خوشی سے بڑبڑانے لگے۔ ”چائے بنوا لینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ گویا اپنے آپ کو تسلی دے رہے ہوں۔ ”رینا ضرور آجائے گا۔“ وہ آ تو جایا کرتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ اچھا میں جاتا ہوں۔ میں ذرا ہو آؤں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گئے۔

”اولڈ گوز۔“ پرکاش انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر دبی آواز سے بولا۔

”دماغ۔۔۔“ پرکاش نے اٹھکی سے سر کو بجاتے ہوئے معنی خیز انداز سے کہا۔ ”چکر۔“

”چکر؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

دروازہ

”یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے۔ رینا۔ اور رینا!!۔ اور یہ کھڑکیاں بھی۔ اور کون ہو گا۔ بس وہی رینا۔ اور کون۔ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اب کیا ہو گا۔ اس کا بس چلے تو سب دروازوں پر تالے لگ جائیں۔“ وہ اپنے آپ ہی بڑبڑاتے رہے اور پھر دفعتاً ان کی نگاہ ہم پر پڑی۔ ”اوہ! تم ہو پرکاش۔ تم آ گئے بہت اچھا کیا تم نے۔ بہت اچھا کیا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔“

”میرے ہم جماعت ہیں۔“ پرکاش نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

”بمراج۔“

”اچھا اچھا۔ بہت اچھا ہوا۔ بڑی مہربانی ہے۔“ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ آپ آ گئے۔ اچھا ہوا۔ پھر انہوں نے حسرت سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ ”مگر یہ دروازہ۔۔۔! اور پھر میری طرف معذرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بولے۔ ”دیکھو نا۔ سبھی دروازے بند کر دیتا ہے۔ رینا آدمی بہت اچھا ہے۔ بہت بھلا آدمی ہے۔ بس دروازے بند کر دیتا ہے۔ گویا ہم قیدی ہیں۔ دیکھا آپ نے۔“ اور ان کے ہونٹوں پر مایوس مسکراہٹ چھا گئی۔

”اچھا ہوا آپ آ گئے۔“ وہ از سر نو بڑبڑانے لگے۔ گویا کچھ کہنے کیلئے بول رہے ہوں۔ اپنی آواز کا سہارا لے رہے ہوں۔ ”پرکاش نے میرا نام دہرایا۔“

”ہاں۔ ہاں۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ نہیں رہتے۔ آپ بیٹھ جائیں۔ آپ مسٹر راج۔ بیٹھ جائیے۔ اور پرکاش! ان کے لئے چائے بھول گئے۔ اچھا اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پر وہ رینا۔ نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ بس چلا جاتا ہے۔ اور دروازہ، یہ دیکھو نہ جانے کیوں بند کر جاتا ہے۔ لیکن وہ آ جائیگا۔ وہ ہمیشہ آجایا کرتا ہے۔ آپ بیٹھئے سب

لیکن وہ پھر بڑا بڑا تے ہوئے اندر آگئے۔ ”لو!“ وہ نہایت یاس بھرے انداز میں بولے۔ ”دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اب کوئی کیا کرے؟“ انہوں نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دروازہ جو ہے۔“ پرکاش نے طنزاً بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اوہ۔“ یہ تو میں بھول ہی گیا وہ چونک کر بولے۔ ”ہاں یہ دروازہ جو ہے۔ ٹھیک ہے۔ بھول جاتا ہوں میں“ انہوں نے معذرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا۔ ”بھول جاتا ہوں مسٹر۔۔ مسٹر۔۔“

”مسٹر بلراج“ پرکاش نے طنزاً دہرایا۔

”مسٹر بلراج! میں بھول جاتا ہوں۔ اچھا تو آپ بیٹھیں آپ۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

”اف یہ دروازے کا مینیا۔ پرکاش نے منہ بنا کر کہا۔ ”کریک ہے کریک۔ تم چپ کیوں ہو۔“ وہ مجھے گھورنے لگا۔

”ہاں ہاں کریک“ میں چونک کر بولا۔ نہ جانے اس وقت میرے دل پر بوجھ کیوں پڑا ہوا تھا۔ نہ جانے مجھے اس وقت تمام دنیا ایک بند دروازے کی طرح کیوں دکھائی دے رہی تھی۔ ”نہیں نہیں میں خاموش تو نہیں۔“ میں نے کہا۔

”خاموش نہیں تو یہ گیان دھیان کی تصویر کیوں بنے ہوئے ہو۔“ وہ بولا میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

”اس سڑی بڑے کی باتوں پر نہ جاؤ۔“ وہ بولا۔ نہ جانے بوڑھا ہو کر انسان سڑی کیوں ہو جاتا ہے۔“

”شاید ہم بھی ہو جائیں۔“

”میں!؟ میں تو اس سے پیشتر اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔“

”چھوٹے بابو جی آئے ہیں۔“ رینا اندر داخل ہوتے ہوئے چلایا ”میں نے کہا تھا بڑے بابو جی سے کہا تھا میں نے۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا۔“

جرور آئے گا کوئی میں نے کہا۔ سو آگئے چھوٹے بابو۔ ہچچول میں تو نہیں پھر کی میری آنکھ کبھی۔ کل سے جو پھر رہی تھی۔ میں نے کہا جرور کوئی آئے گا۔ اور سب اچھے ہیں نا۔ پر آپ تو کلج سے آئے ہیں نا۔ اور چائے نہیں پی کیا۔ ابھی تو نہیں پی ہوگی۔ پیتے بھی کیسے میں تو اب آرہا ہوں۔ ابھی لائے دیتا ہوں۔ ابھی۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ اندر جانے لگا۔ لیکن دفعتاً رک گیا اور دیوار کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”بڑے بابو جی کہاں گئے۔ اندر تو نہ ہوں گے وہ۔“

پرکاش بولا۔ ”ابھی باہر گئے ہیں۔“

وہ ہماری طرف مخاطب ہو کر شکایت کرنے لگا۔ ”نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔ کہاں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بس میں ہو آؤں ہو آؤں میں جیسے دھپتر جانا ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”چھوٹے بابو دیکھو نا ہر سے کھوتے رہتے ہیں۔ جیسے کوئی چھو کر اسکول سے بھاگ ریا ہو۔ اب کوئی کہاں تک ان کے پیچھے مارا مارا پھرے۔ ہچچول میں۔ کل باگ میں بیٹھے تھے۔ دیکھا مجھے تو اٹھ بیٹھے۔ اچھا تو اب گھر ہی جانا ہے نا۔ جانا جو ہوا گھر۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے ہے چھوٹے بابو۔ پر آپ کی چائے۔“ دفعتاً وہ چونک کر بول۔ ”ابھی ماما ہوں چھوٹے بابو ابھی۔“ یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گیا۔

پرکاش کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”دیکھایک نہ شد دوشہ۔“

لیکن نہ جانے مجھے ہنسی کیوں نہ آئی۔ میں چپ چپ بیٹھا رہا۔ ”یہاں ڈاکٹر کا تو پتہ ہی نہیں۔ دونو ہی مسٹر ہائیڈ ہیں۔“ پرکاش مسکرایا۔ ”ایک دروازے بند کرتا پھرتا ہے اور دوسرے انہیں کھولنے کے لئے ترستا ہے۔ مگر ایسا نہیں کر سکتا کہ خود تکلیف کر کے کھول لے۔ عجب تماشہ ہے۔“

”ہاں“ میں نے مسکرائے کی کوشش کی۔

”چپ کیوں ہو تم۔“ وہ مجھ سے ہلکا۔

”چپ کہاں ہوں۔“ میں نے چمک کر کہا۔

”چپ تو ہو تم۔“ وہ بولا۔ ”تم بھی تو یہاں اگر بند کھڑکی بن گئے ہو۔“

”چلو تم ہی کھلا دروازہ ، سہی“۔ میں نے اسے چڑانے کیلئے کہا۔
 ”ہم تو ہیں۔“ وہ بولا۔ اور اٹھ کر کھڑکیوں کی طرف چلا۔ ”آخر ہمیں کوئی
 کھلی کھڑکی مل ہی جائے گی نا“۔ یہ کہہ کر وہ باہر دیکھنے لگا۔
 ”ارے“ وہ چلایا ”یہ سنا تم نے“۔
 ”نہیں تو“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“
 ”یہ آواز“۔۔۔۔۔ بڑی سریلی ہے۔“
 ”آواز“ میں نے پوچھا۔

”سننے نہیں“ وہ بولا۔ یہ بغل کے کمرے سے آواز آرہی ہے اس دیوار سے
 اس طرف۔ ”میں دیکھ آؤں ذرا“ پرکاش باہر نکل گیا۔ اور میں پھر اپنے خیالات
 میں کھو گیا۔
 کچھ دیر کے بعد پرکاش ہنستا ہوا لوٹا۔ ”بھئی واہ کیا چیز ہے اس ساتھ
 والے کمرے میں۔“

”چاہے اپنے گھر ہی سے کوئی ہو۔“

”واہ۔“ وہ ہنسا چھا تو اکیلے رہتے ہیں۔ اور یہ کمرے کرائے پر ہیں۔ کیا
 سمجھے؟ جاتے ہو۔ کون ہے سلاخدار کھڑکی کے پیچھے؟ یوں میٹھی ہے ظالم، جیسے
 کوئی کماری قید ہو۔ لیکن دوست! یوں معلوم ہوتا ہے گویا پہلے ہی سے کوئی
 نگاہ پر چڑھا ہوا ہے۔ منتظر میٹھی میں آپ۔۔۔۔۔ تم نے آواز نہیں سنی
 تھی۔ اچھا اب بولی تو بتادوں گا۔ ارے یاد صاف آواز آتی تھی۔ یہ ساتھ والا
 کمرہ تو ہے ذرا دھیان رکھنا۔“

”لو۔ سارے دروازے کھل گئے ہیں۔“ رینا بڑبڑاتا ہوا چائے لے کر
 داخل ہوا۔ ”اب کوئی کیا کرے۔ بابو جی تو حد کر دیتے ہیں۔ حد۔ میں پوچھوں
 اگر ٹھنڈ لگ جاوے تو۔ اور ٹھنڈ نہیں تو بجاہ باتیں ہیں۔ کتنا بلی آجاوے تو
 اس نے چائے میز پر رکھ دی اور آپ بھی تو اتنی جماعتیں پاس ہیں چھوٹے بابو!
 بھلا ایسی بات بھی سنی ہے کبھی۔ یہ دروازہ کھول دو۔ گھر نہ ہوا دکان ہوئی۔ اور

سچ پوچھو چھوٹے بابو! تو دکان بھی ایسے نہیں ہوتی۔“

”رینا“ پرکاش بولا۔ ”یہ دروازے کھولنے کا خط ہے کیا؟“

”کون جانے چھوٹے بابو۔ میری سمجھ میں تو نہ آوے ہے یہ بات۔ جوانی
 میں تو اچھے بھلے تھے۔ ان کی طرح“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

”جی!“ رینا چمکا۔ ”بڑے ٹھاٹھ تھے جب تو۔ بڑا مجاج تھا۔ رام کا دیا
 کا بھی تھا مہاراج۔ پھر جوانی بھر کر آئی تھی۔ بجاہوں میں ایک تھے۔ یہ اونچا
 لمبا قد اور درد بھری آنکھیں مست دکھیں تھی۔ پر چھوٹے بابو جب بھی چھپ
 چھپ کے رہتے تھے۔ اکیلے میں بیٹھ رہتے۔ نہ ہنسی نہ ہجاک۔ چپ سی لگی
 رہتی تھی۔ پر پھیشن میں پیچھے نہ رہتے۔ یہ گلے میں بندھنے والی اور مہاراج
 سوٹ۔۔۔۔۔ بڑی ٹس پھس تھی۔“ اس نے ایک آہ بھری۔ میں بھی تو
 جوان تھا ان دنوں۔ چھوٹے بابو بس سارا جیون اسی گھر میں بیت گیا۔“

”ہوں تو بڑے مزے میں رہتے تھے چچا جی۔“ پرکاش مسکرانے لگا۔

رینا نے آنکھ سے ایک ان بہا آلو پونچھا۔ ”جی بڑے بچے میں۔ یہ ہیں
 اسی سڑک پر مکان لیا ہوا تھا۔ اوھر چوک کی طرف چوبارہ تھا ایک۔ سڑک پر ہی
 ہے وہ بس بابو جی اور میں۔“

”نسبت روڈ پر۔“ پرکاش چلایا۔ ”یہاں تو میلا لگا رہتا ہے نا لڑکیوں
 کا۔“

”اونہوہ چھوٹے بابو۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ان دنوں تو یہ جگہ کھالی پڑی
 تھی۔ اکا دکا مکان تھا۔ ہاں کالج کے سے گجرتی تھیں۔ بس دو ایک۔“

”دو ایک۔“ پرکاش نے پوچھا۔ ”لیکن رینا! یہ بھی کیا کم ہے۔ ہمیں تو
 ایک بھی میسر نہیں آتی۔“

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسا۔ ”چھوٹے بابو تو ہجاک کرتے ہیں“ اس نے مجھے
 مخاطب کر کے کہا۔ ”پر آپ جانیں ہیں۔“ ”روئیہ کو کون پوچھے ہے مہاراج۔
 ہاں بابو جی۔“ وہ پھر ہنسا۔ بڑا رنگیلا مجاج تھا ان دنوں بابو جی کا۔ پر چھوٹے

ہاں بلیر کماری ۔ وہ کماری بڑی پرکھ والی تھی ۔ میں جانوں اسے سب پتہ تھا اسے ۔ مالوم تھا میں دیکھ ریا ہوں ۔ جب وہ میری رسوئی کی کھڑکی کے سامنے آتی تو جرور ایک نجر اٹھا کر دیکھتی ۔ گور سے دیکھتی تھی ۔ جاتی ہوگی وہ کہ میں بابو جی کا رسوئیہ ہوں ۔ جرور جاتی ہوگی ۔

”تم بھی تو جوان تھے۔“ پرکاش مسکراتے لگا ۔

”آپ تو مجاک کس ہیں ۔ اس نے حسرت بھری آواز سے کہا ۔ جوانی تو چھوٹے بابو انہیں ہی آوے ہے جنہیں رام نے دیا ہے ۔ رسوئیہ کی جوانی بھی کیا جوانی ہے ۔ چھوٹے بابو ۔ وہ تو رسوئیہ ہوا ۔ چاہے بڑھا ہو یا جوان ۔ اور پھر مہاراج وہ لکھ پتی کی بیٹیا ۔ آپ تو مجاک کس میں مہاراج ! ۔ اس نے ایک آہ بھری اور مجھے مخاطب کر کے کہا ۔ پھر اک دن بابو جی ادھر سے جا رہے تھے ۔ اور کماری ادھر سے آرہی تھی ۔ جب دونوں میں تھوڑا پھاسلہ رہ گیا اور بابو جی روج کے سمان پڑی سے سڑک پر اترے تو وہ بھی پڑی چھوڑ سڑک پر اتر آئی ۔ شاید وہ بھی اس وری پڑی پر آنا چاہے تھی مہاراج ! بابو جی یہ دیکھ کر یوں گھبرائے کہ ایک بھینس جو جا رہی تھی اس سے جا ٹکرائے اور وہ مسکرائی ۔ پر چھوٹے بابو ۔ بابو جی کو بہت چوٹ آئی ۔ اور وہ دیوی مسکرا کر اپنی راہ چلی گئی مٹر کر بھی نہ دیکھا اُس نے۔“

اسکے روج بابو جی کلج جانے کی جد کرنے لگے ۔ پر چھوٹے بابو میں نے جانے نہ دیا ۔ اتنا بڑا جھم ہو گیا تھا ٹانگ پر ! میرے کہنے سے گئے تو نہ پر جی ، دیکھے بنا نہ رہ سکے ۔ گسٹکھانے کی کھڑکی سے دیکھتے رہے ۔ ادھر میں بھی دیکھ ریا تھا کہ دیکھوں آج بابو جی کو پڑی پر نہ پا کر کیا کرتی ہے وہ ۔ میرا کھیال تھا چھوٹے بابو ، کہ اس رانی کا کیا گیا تھا ۔ اس کی بلا سے چاہے کوئی مرے یا جئے ۔ پھر وہ آئی اور اس نے دور سے دیکھا چاروں طریقہ دیکھا ۔ اور پھر یوں چپ چاپ چلے گئی جیسے مٹی کی بنی ہو ۔ نہ وہ لٹک ، نہ ہنسی ۔ دوسرے دن بھی وہ یونہی گجری ۔ پر تیسرے دن وہ نل کے پاس آکر رگ گئی ۔ نل رسوئی کی کھڑکی کے سامنے تھا ۔ بالکل سیدھ میں ۔ رکی ، پھر چلنے لگی ۔ پھر رگ گئی اور سر اٹھا کر اوپر

دیکھا ۔ میری طریقہ ۔ اور چھوٹے بابو میرا تو جی بیٹھ گیا ۔ ایک تو اس کا روپ اور دوسرے اس کی آنکھیں لال سی ہو رہی تھیں ۔ پھر ہاتھ اٹھا کر اٹھکی سے مجھے بلایا ۔ اور چھوٹے بابو ! میں گولی سمان اڑ کر پہنچا اور پاس جا کھڑا ہوا ۔ بولی ۔ تم رسوئیہ ہو ۔ میں نے سر ہلایا ۔ کہنے لگی تمہارے بابو کیسے ہیں ۔ جیادہ چوٹ تو نہیں آئی ۔ چوٹ تو آئی ہے پر اچھے ہو جائیں گے ۔ میں نے جواب دیا پھر بولی ۔ تم یہاں اکیلے رہتے ہو ۔ میں نے سر ہلا دیا اور کہا میں اور بابو جی ۔ بس چھوٹے بابو پھر وہ چلی گئی ۔ اس نے اک آہ بھر کر کہا ۔ ”واپس آیا تو بابو جی رستہ روکے کھڑے تھے ۔ بولے ۔ کہاں گیا تھا رینا ۔ جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں ۔ مجھے مالوم تھا چھوٹے بابو کہ وہ گسٹکھانے میں چھپ کر دیکھ رہے ہیں ۔ میں نے آپ دیکھا تھا انہیں ۔ میں نے منہ پٹکا کر لیا ۔ اور کہا ۔ جری بھیتا کے پاس گیا تھا ۔ پھر بابو جی منتیں کرنے لگے ۔ نہیں نہیں رینا سچ بتاؤ کیا کہتی تھی وہ ۔ مجھے مجاک سوچھا ۔ کیوں نہ سوچتا۔“ وہ چمک کر بولا ۔ ”وہ کیوں چھپ چھپ کر کرتے تھے بات ! میں نے کہا ۔ کہتی تھی تمہارے بابو جی یہاں کرینگے مجھ سے ۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں ۔ میری جُبان ہی ایسی ہے ۔ بس جو کہدوں پورا ہو جاوے ہے ۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یونہی ہو جائے گا۔“ اس نے آہ بھر کر کہا ۔ ”اچھا ؟۔۔۔۔۔ تو یونہی ہوا کیا ۔ بڑے دھرماتما ہو تم۔“ پرکاش بولا ۔

رینا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا ۔ ”جی دھرماتما کیا بنوں کامیں ، میری جُبان ہی ایسی کالی ہے ۔ ادھر بات نکلی ادھر پوری ہو گئی ۔۔۔۔۔ بس جی کیا بتاؤں مہاراج ۔ دوسرے دن وہ کماری آپ ہی آپ اوپر آگئی ۔ گھر میں ۔ میں آلو پھیل رہا تھا ۔ اور بابو اندر پلنگ پر پڑے تھے ۔ وہ تو پڑے ہی رہتے تھے نا ۔ ابھی جھم اچھا نہ ہوا تھا ۔ ہو بھی جاتا چھوٹے بابو تو دل کا جھم تو تھا ہی ۔ دل کا جھم کب اچھا ہووے ہے چھوٹے بابو۔“ اس نے ایک آہ بھر کر کہا ۔ ”کبھی نہیں کبھی نہیں۔“

”معلوم ہوتا ہے تمہیں بھی کوئی دل کا زخم لگا ہے۔“ پرکاش اُسے چھیڑنے لگا ۔

”اجی مہاراج“۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”کون ہے جسے دل کا جکھم نہ ہووے ہے، چاہے رسوید ہی کیوں نہ ہو۔ سبھی کو ہووے ہے چھوٹے بابو۔ کیا بھاکوان کیا فردھن۔“

”اچھا تو وہ تمہارے گھر آگئی۔“ پرکاش نے اسے یاد دلایا۔

”جی ہاں تو آلو پھیل ریتا تھا میں۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو کماری جی کھڑی ہیں۔ میں تو کھڑا رہ گیا اور چھوٹے بابو، چاقو استا سا اٹھکی میں چلا گیا۔ اور مجھے مالوم بھی نہ ہوا۔ اور کھون بوند بوند گرے ہے اور وہ حیران، دیکھے ہے میری طرح۔ ادھر بابو جی نے دیکھ لیا ہوگا۔ اور وہ جکھم والی ٹانگ سمیت اٹھ کر دروازے میں آکھڑے ہوئے۔ اور میں حیران کھڑا بابو جی کو دیکھوں ہوں۔ اور بابو جی کماری کے منہ پر نخر جمائے حیران کھڑے دیکھیں ہیں۔ چھوٹے بابو اس روج تو ”وہ ہنسنے لگا۔“ اس روج تو ہائیسکوپ ہو ریتا تھا۔ ہمارے گھر میں، پھر مہاراج نہ جانے کماری جی کو کیا ہوا۔ مڑ گئی جیسے جارہی ہو اور میں حیران کہ آئی بھی اور چل بھی دی۔ ادھر بابو جی بڑبڑائے اور تپتھے دوڑے، پر دو کدم رک کر کھڑے ہو رہے۔ پھر میں ہی بولا۔ چائے تو پی جاتے دیوی جی۔ تیار ہی ہے اور وہ بن دیکھے بولی۔ آج نہیں پھر سہی اور ہولے ہولے سیرمیاں اترتی گئی۔ اور بابو جی نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہے، انہیں پوری بات کرنے کی ہمت بھی ہوئی؟ پھر وہ آپ ہی پھلی سیرجی پر پہنچ کر رکی۔ ہم دونوں تو کٹھن سے لگے نیچے جھانک رہے تھے۔ نخر بھر کر اوپر دیکھا اور بولی اب تو تمہارے بابو جی اچھے ہیں نہ رسوید! جی جی۔ بڑی مہربانی ہے بابو جی بڑبڑائے اور میں بھاگ کر نیچے اتر گیا۔ میں نے کہا دیوی جی چائے تو پی جائیے۔ اور وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ نہیں رسوید، پھر سہی۔ پھر آؤں گی میں۔ اور جی، یہ کہہ کر پھر اوپر دیکھا بابو جی کی طرح اور مسکرائی ”ریتا ایک آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔“

کچھ دیر کے بعد اس نے آپ ہی سلسلہ کلام جاری کر دیا۔ ”اگلے روج وہ پھر آئی۔ اس روج تو میں نے بٹھا ہی لیا۔ میں نے کہا دیوی آج تو چائے پلائے بنا نہ جانے دوٹھا میں۔ یہ آپنی کا گھر ہے۔ یہ سن کر وہ مسکرائی اور نیچی

نخر سے بابو جی کو دیکھا وہ بھی مسکرائے۔ بڑی تیج تھی وہ۔ بڑی۔“

”جب میں چائے لے کر آیا چھوٹے بابو! اور انہیں ایک بیج پر بیٹھے دیکھا۔ تو میرا جی بہت کھش ہوا مہاراج۔ بہت۔ مجھے دیکھ کر بولی رسوید تمہاری اٹھکی کیسی ہے۔ اور چھوٹے بابو نہ جانے میں نے اٹھکی کیوں چھپالی۔ بس چھپالی میں نے اور کہنے لگا۔ اٹھکی کو تو کچھ نہیں ہوا دیوی جی۔ وہ مسکرائی۔ کل کٹ جو گئی تھی۔ میں نے کہا دیوی یہ اٹھکیاں تو روج ہی کتنی ہیں۔ رسوید جو ہوا۔ چاکو کا کام ہے دیوی۔ ان اٹھکیوں کا کیا ہے۔ اور چھوٹے بابو جی پھر جو میں نے چائے رکھ کر سیب چیرنے کو چاکو اٹھایا تو اس نے چاقو میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اونہوہ۔ اٹھکی کٹ جانے کی اور مسکرائی۔ میں نے کہا نہیں دیوی جی روج تو نہیں کتنی۔ اور میں سرما کی رسوئی میں آگیا۔ پھر وہ اکیلے بیٹھے رہے۔ بابو جی کو تو بس چپ لگی تھی۔ ہاں وہ کبھی کبھی کچھ کہہ دیتی۔ میں نے تو صرف استا ہی سنا کہتی تھی اس روج آپ گر کیوں گئے۔ پھر بولی۔ پڑی سے اتر کیوں آتے تھے آپ۔ پھر وہ جانے کیا کہا اس نے اور وہ کیا بولے، مجھ سے تو سنا نہ گیا۔ چھوٹے بابو۔ پھر وہ جوڑ سے ہنسی ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ اور مجھے آواج دے کر بلایا۔ رسوید یہ دیکھو تو کیا کر رہے ہیں تمہارے بابو جی۔ اور میں بھاگا بھاگا گیا دیکھوں ہوں بابو جی شکر والی پیالی میں چائے ڈال چکے ہیں۔ شکر والی پیالی میں چائے بنانے لگے تھے۔ بابو جی بولے میں بھی پاگل ہوں۔ رسوید وہ مسکرائی تمہارے بابو جی کو کیا ہو گیا ہے اور نیچی نخر سے ادھر دیکھا میں نے کہا۔ دیوی آپ جانیں۔ وہ بولی کیوں میں کیوں جانوں۔ میں نے کہا۔ آپ نہ جانیں تو کون جانیں اور وہ سرما سی گئی۔ میں اور لاتا ہوں شکر میں نے کہا اور ٹل گیا وہاں سے، مہاراج۔ اس سے تو میں کھا کھا تھا چھوٹے بابو۔ پر نہ جانے جلدی میں مجھے کیا ہوا شکر والے پیپے کو چھوڑ سوچی کی پیالی بھر لیا۔ میں پیالی لے کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے چچہ بھرا اور مسکرائی اور پھر ہنسنے لگی۔ میں حیران۔ ادھر بابو جی حیران پر وہ کھش تھے۔ بڑے کھش۔ یہ کیا ہے وہ بولی۔ شکر ہے۔ میں نے کہا۔ اچھی شکر ہے یہ، وہ ہنسی اب میں جو دیکھ رہا ہوں تو سوچی تھی۔ اوہ میں چلایا۔ بالکل پاگل ہے، بابو جی بات سمجھ کر چلائے۔ دیکھ

کر کام نہیں کرتا۔ اور وہ اس شکر کی پیالی کی طرف دیکھ کر ہنسی جاوے تھی۔ جس میں بابو جی نے چائے ڈال دی تھی۔ پھر بابو جی نہ جانے سمجھ کر یا ویسے ہی چپ سے ہو گئے پر مہاراج ان کی اپنی سدھ بدھ ماری دی تھی۔ بھلا بات کیا کرتے۔ ویسے آج کل کے لڑکے تو اتنی باتیں کہیں ہیں کہ لوگ منہ دیکھتے رہ جائیں ہیں۔ پر چھوٹے بابو ان کی باتیں جی بھی تک چلیں ہیں۔ جب تک کوئی دور جارہی ہو۔ اور ہمارے بابو جی تو بس پی جانا ہی جانیں تھے۔ وہ چلی گئی تو پھر وہ لگے مجھے کھور نے رینا یہ کیا کیا تو نے سوچی لا دی وہ کیا کہتی ہو کی مجاک کیا ہے مجھ سے۔ اور چھوٹے بابو میں چپ۔ اور کرتا بھی کیا۔ آکھر رسوئیہ ہی ہوں نا چاہے وہ کیسا اچھا ہی کیوں نہ جانیں۔ پھر بھی رسوئیہ ہی ہے۔

”ہوں۔ ٹھیک ہے رینا۔“ پر کاش بولا۔ ”اچھا تو پھر بھی کبھی آئی وہ۔“

”ہاں چھوٹے بابو صرف ایک دہچھ۔“ وہ چپ ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور چند ساعت کے لئے بت بنا بیٹھا رہا۔

”دن ڈھلا ہوا تھا اور میں رسوئی میں بیٹھا تھا۔ بابو جی اندر لیٹے دے تھے۔ وہ آئی اور منہ پر اٹھکی رکھ مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر پاس آئی اور میرے کان سے منہ لگا کر بولی۔ کہاں ہیں۔ میں نے اٹھکی سے بتایا کہ اندر لیٹے دے ہیں۔ بولی چپ پھر ایک لپھا پھ نکال کر دیا مجھے یہ دے دو انہیں۔ پر انہیں یہ نہ بتانا کہ میں لٹی ہوں۔ کہنا کوئی دے گیا ہے۔ اور کہنا جواب مانگا ہے۔ میرا بتایا تو میں ناراج ہو جاؤں گی۔ چھوٹے بابو کیا بتاؤں۔ وہ کچھ کہے اور اُسے نہ کرنا مشکل ہو جائے تھا۔ ایسی اچھی تھی وہ۔ وہ تو کونے میں لگ، چھپ کر کھڑی ہو گئی اور میں سمجھا کچھ مجاک ہے۔ سو میں بھاگ کر بابو جی کے پاس لے گیا وہ لپھا پھ۔ مجھے کیا مالوم کیا بھرا ہے اس میں۔ بابو جی نے کھولا۔ پڑھا اور رنگ ہلدی سا ہو گیا۔ بولے کس نے دیا ہے تمہیں۔ میں نے کہا بابو جی ایک لڑکا آیا تھا اُس دیوی نے بھیجا ہے۔ اور جواب کو کہا ہے۔ بولے کب آیا تھا۔ میں نے کہا جب آپ پڑھنے کئے دے تھے۔ اوہ۔ اوہ وہ پاکلوں کی طرح

پہرنے لگے۔ اب میں کیا کروں۔ کیا کروں میں۔ اب کیا ہو گا رینا! اور میں حیران میں نے پوچھا کیا لکھے ہیں۔ بولے کچھ نہیں، کچھ نہیں، تم اب جاؤ۔ جاؤ تم۔ اب جو میں رسوئی میں آیا تو وہ کونے سے لگی کھڑی تھی۔ منہ پر ہنسی پر چھوٹے بابو جعفران کی سمان جرد رنگ۔ پھر میرے کان سے منہ لگا کر بولی۔ پوچھو، جب وہ لڑکا آئے تو کیا جواب دوں۔ مجھے تو ڈر لگتا تھا بابو جی کے سامنے جاتے دے۔ پر اس نے کہا۔ تو کیسے نہ جانا میں۔ چلا گیا اور وہ جواب کا سن کر چپخنے لگے۔ رینا، رینا سچ بتا یہ انہوں نے بھیجا ہے۔ سچ بتا رینا۔ جی، میں نے کہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولے۔ اب کیا ہو گا۔ اچھا رینا مجھ سے ایسا مجاک نہ کرو۔ میں نے کہا، بابو جی میں کیوں کرنے لگا آپ سے مجاک۔ لیکن میرے ماتا پتا، وہ بولے کیا کہیں گے۔ رینا۔ ماتا تو مان جانے پر پتا جی کیسے مانیں گے اور۔ اور رینا جانے وہ کون ہے۔ نہ جانے کیا جات ہے اسکی۔ میں پتا جی کو کیا بتاؤں گا۔ نہیں نہیں میں پتا جی سے کیسے کہہ سکتا ہوں رینا میں نہیں جاؤں گا نہیں جاؤں گا۔ میں حیران چھوٹے بابو۔ اب میں کھڑا ان کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر جو سر اٹھایا میں نے تو دروازے میں وہ آپ کھڑی ہے۔ لال، لال آنکھیں اور ہونٹ گے سے بھرے دے۔ ایک نمر اس نے بابو جی کی طرح دیکھا۔ اور بابو جی بُت بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ بولی۔ آپ کو مجھ سے کرج ہے یا جات ہے۔ وہ چل پڑی، اب بابو جی پاکلوں کی طرح پیچھے بھاگے۔ اور بولے نہ جاؤ بلیر!!۔ یہ اس کا نام تھا نا نہ جاؤ گے نہ ہو جانا بلیر!۔ میرے ماتا پتا۔ میں ان کی مرجی بنا کیا کر سکتا ہوں۔ تم نہ جاؤ۔ آکھر چھوٹے بابو وہ کھڑی ہو گئی اور بولی اچھا تو پوچھ لیجئے اپنے مات پتا سے۔ اگر وہ مان جائیں تو مجھے ملنا۔ اگلے بدھ کو ہاک میں ملوں گی میں۔ اسی وقت۔ اور اور وہ ہونٹ کٹ کر بولی۔ اگر نہ ملے آپ تو بس میں سمجھ لوں گی کہ وہ نہیں مانے۔ پھر میں کبھی نہ ملوں گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

”چھوٹے بابو مجھے کیا کبھی تھی کہ یہ بات ہے۔ میں تو مجاک سمجھتا رہا۔ پر اس سے مجھے مالوم ہو گیا کہ مجاک نہیں۔ اور بابو جی تو پھر بالکل اپنے آپ سے

نے چپکے سے سر ہلایا۔ پھر وہ بولے لیکن ماما جی۔ ماما جی نے تو نہ، نہ کی ہو گی۔ رینا بتاؤ مجھے۔ تم چپ کیوں ہو۔ میں نے کہا۔ جی وہ کہیں تھیں۔ جو ایسا کیا اُس نے تو میں جہر کھا لوں گی۔ جہر؟ وہ بولے، اور پھر دھم سے پننگ پر گر پڑے۔ اب بابو جی کا اور بھی بُرا حال ہو گیا۔ ہر سے بولتے۔ نہیں نہیں رینا میں نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا رینا۔ کیا ماما جی سچ سچ جہر کھالیں گی۔ رینا سچ بتاؤ۔ اب میں کیا بتانا بابو جی۔ پھر وہ آپ ہی آپ بولتے رینا میں جرور ملوں گا۔ میں جرور ملوں گا۔ میں جیوں گا۔ مجھے جینا ہے رینا۔ مجھے بھی کئی بار کھیال پڑتا ہے چھوٹے بابو کہ نہ جانے وہ کون دیوی ہے۔ نہ جانے کیسے لوگ ہیں وہ۔ بڑے لالہ جی سچ کہتے ہیں، پر مجھے پوچھتا ہی کون تھا۔ ہاں بابو جی کی حالت دیکھی نہ جائے تھی۔

پھر بدھ کا دن آگیا جب اس نے باگ میں ملنا تھا بابو جی سے پر اس روج تو بابو جی نڈھال پڑے تھے، مہاراج آٹھ دن نہ کھایا نہ پیا اور ہر سے اٹھ اٹھ کر پاگلوں کی سمان بھاگنا۔ مجھ سے بولے رینا پتا جی کی اور بات ہے پر ماما جی، ماما جی نے جہر کھا لیا تو۔ لیکن رینا میں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ پھر آپ ہی آپ سوچ میں پڑ جاتے۔

جب دو گھنٹے رہ گئے تو مجھے بلایا۔ بولے رینا۔ مجھے ڈر ہے میں چلا نہ جاؤں۔ رینا ماما جی کو بچالو۔ تم ماما جی کو بچا سکتے ہو رینا!۔ ماما جی کو بچانا تمہارا دھرم ہے رینا۔ میں بچا لوں۔ میں حیران، چھوٹے بابو میں بھلا ماما جی کو کیسے بچا سکتا تھا۔ بولے ہاں تم بچا سکتے ہو ماما جی کو رینا۔ بچاؤ گے؟ میں نے سر ہلا کر ہاں کہہ دیا اور کیا کرتا میں چھوٹے بابو۔ بولے سوکند کھاؤ۔ میں نے کہا بھگوان جانتا ہے۔ جو آپ کہیں گے کروں گا۔ بولے اچھا تو ایک تالہ لے آؤ۔ پھر وہ میرے ساتھ پچھلے کمرے میں چلے گئے اس کمرے کا ایک دروازہ تھا۔ بولے رینا یہ لو دو روپے آج دونو شو دیکھنے ہیں تم نے۔ میں حیران۔ بولے اور جاتے دے ہیں کمرے کو باہر سے تالہ میں نے پوچھا، بولے اور جاتے دے اس کمرے کو باہر سے تالہ لگا دینا۔ تالہ میں نے پوچھا، بولے ہاں کہیں

بھی گئے۔ کبھی روتے کبھی لیٹ رہتے اور کبھی آپ ہی آپ ادھر ادھر پھرتے اور بڑبڑاتے۔ پتا جی کیا کہیں گے۔ نہیں نہیں میں تو پتا جی سے نہ کہوں گا۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اور پھر چپ ہو جاتے اور کچھ دیر کے بعد پھر بولتے۔ نہیں نہیں میں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ میں جاؤں گا جرور جاؤں گا چاہے کچھ ہو۔ رینا۔ رینا میں جاؤں گا اور چھوٹے بابو ساری ساری رات نہ سوئے۔ سوتے بھی تو آپ ہی آپ اٹھ بیٹھتے اور یہی چلاتے۔ پھر مجھے مالوم ہوا کہ اس نے میاہ کے لئے لکھا تھا۔ پر چھوٹے بابو کبھی سنا ہے۔ آپ نے کہ لڑکی آپ اپنے میاہ کی بات کرے۔ توہ۔ پر وہ کلج کی تھی نا! بارہویں میں تھی۔ کلج کی لڑکی کا کیا ہے چھوٹے بابو چاہے جو بھی کہہ دے۔ اس کا کیا ہے۔ اور وہ تھی بھی ایسی تیج۔

”اس روج کے بعد“ اسنے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”میں نے اس کو اس سڑک پر سے گزرتے نہ دیکھا۔ میں سارا سارا دن کھڑا رہتا۔ چھوٹے بابو پر وہ آتی تو دکھتی نا۔ ادھر بابو جی بھی اتجار کرتے پر وہ نہ آئی۔ اور بابو جی کی حالت مجھ سے دیکھی نہ جائے تھی۔ سو چھوٹے بابو میں نے بابو جی کو دلاسا دیا۔ اور آپ بڑے لالہ جی سے بات کرنے کے لئے گاؤں چلا گیا۔ پر چھوٹے بابو وہاں میری بات کون سنے تھا۔ بڑے لالہ جی سے بات کی تو وہ ہنس پڑے بولے کس کی لڑکی ہے وہ کتنی جائداد ہے اس کے پتا کی۔ اور ان کی جلت کیا ہے۔ اب میں کیا بتاؤں بابو جی۔ بس چپ ہو رہا میں۔ پر ماما جی سے میں نے ساری بات کہہ دی۔ ساری بات سنادی انہیں۔ اور ماما جی تو سن کر مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ بولیں اچھا اب ایسا ہو گیا ہے وہ۔ فرج کہیں کا۔ رینا اگر اس نے ایسی ویسی سے میاہ کر لیا تو میں جہر کھا لوں گی جہر! نہ جانے کیا کیا بولتی رہی وہ رینا نے آہ بھری۔ بس مہاراج میں اپنا سامنہ لئے آگیا واپس۔

بابو جی نے مجھے دیکھا اور جھٹ سمجھ گئے۔ بولے۔ میں تو پہلے ہی جانوں تھا۔ میں جانتا تھا وہ نہیں مانیں گے۔ رینا، رینا تم بولتے نہیں۔ بولو کیا کہا ہے انہوں نے، پتا جی کیا کہتے تھے۔ تو چھوٹے بابو اب میں کیا کہتا۔ میں

میں چلا نہ جاؤں مجھے ڈر ہے میں چلا جاؤں کا رینا میں چلا جاؤں گا۔ ماما جی کو
پچانا تمہارا دھرم ہے رینا۔ جاؤ۔ ابھی تالہ لگا کر چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ اور مہاراج
وہ دھڑام سے پلنگ پر گر پڑے اور رو رو کر حال بچال کر لیا۔ اب میں کیا کرتا
مہاراج میں نے دروازے کو باہر سے تالہ لگا دیا اور آپ چلا گیا۔

”تو پھر وہ کبھی نہ آئی۔“ پرکاش نے پوچھا۔

رینا نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس سے اس کی آنکھوں میں ان بچے آنسو
چھلک رہے تھے۔

”اور دروازہ بند ہی رہا“ پرکاش گنگنایا۔

”جی“ رینا بولا۔

عین اس وقت ساتھ والے کمرے سے کسی کی آواز آئی۔ ”ساوتری۔ تم
پھر کھڑکی میں آ بیٹھی ہو۔ ساوتری۔ تم سے جو کہا ہے دروازہ کھول کر نہ بیٹھا
کرو۔“

پرکاش چونکا۔ اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”سنا تم نے یہ کرا ہے اس کا۔
غالباً اس کا پتا کھور رہا ہے۔ ساوتری۔ اچھا نام ہے۔“

”چل اٹھ یہاں سے“ آواز آئی پھر آئی ”راجو یہ کھڑکی بند کر دو بند کر دو
اسے۔“

معاذ باپو جی کمرے کے بیرونی دروازے کے پیچھے بڑبڑائے ”لو یہ دروازہ بھی
بند ہو گیا۔ یہ بھی بند ہو گیا۔ اب کوئی کیا کرے۔ رینا اور رینا۔“ رینا نے جلدی
اٹھ کر دروازہ کھولا اور وہ اندر آ گئے۔ ”تم آ گئے رینا۔ بڑا اچھا ہے۔“ وہ
بڑبڑاتے ہوئے ہماری طرف آئے ”تم آ جایا کرتے ہو، رینا ضرور آ جایا کرتا ہے۔
مسٹر۔ مسٹر۔“

”مسٹر بلراج۔“ پرکاش نے انہیں یاد دلایا۔

”مجھے نام یاد نہیں رہتے۔ مسٹر راج۔ اچھا ہوا تم نے چائے پی لی۔“

بڑا اچھا ہوا۔ مہربانی ہے۔ مہربانی۔ رینا اب دروازہ بند نہ کرنا وہ بولے۔ ہم
قیدی نہیں۔ نہیں ہم قیدی نہیں ہیں۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ مجھے جانا
ہے۔ میں ذرا ہو آؤں۔ رینا۔ اوہ پھر چلا گیا۔ وہ شکایت کرنے لگے۔ لیکن
ان کی آنکھیں۔ حسرت، یاس اور بے بسی سے بھری تھیں۔ اچھا میں ہو
آؤں۔ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئے۔



گہرائیاں

ویسے تو شیخ صاحب محلے بھر میں نہایت شریف آدمی سمجھے جاتے تھے۔ مگر بیویوں کے حق میں لوگ دل ہی دل میں انہیں مہلک سمجھتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اور ثبوت یہ تھا۔ کہ ان کی تینوں بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہو چکی تھیں۔ انہیں بیویاں اولے بدلنے کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ اسی بات پر وہ اکثر مغموم رہا کرتے تھے۔ اور جب کبھی وہ شہزادہ سے بات چیت کرتے تو خواہ مخواہ ان کی گردن جھک جاتی۔ ان کے منہ سے میساختہ ”جی ہاں جی ہاں“ نکل جاتا اور ان کے انداز سے ایسا ظاہر ہوتا جیسے وہ اسے بیاہ کر لانے کی تلافی کر رہے ہوں۔

شہزادہ ان کی چوتھی بیوی تھی۔ اور ان کے دوست مولوی محمد عثمان کی بیٹی۔ مولوی صاحب نہایت پاکباز آدمی تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ جسم نجات کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو اسی اصول کے ماتحت روحانی تربیت دی تھی۔ مگر وہ روحانی تربیت شہزادہ کے جسم کی نشوونما کو روک نہ سکی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے متناسب جسم کے بیچ و خم کو شباب نے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اور شہزادہ اس اصول سے ابھر کر ایک حسین مجسمہ بن گئی تھی۔ جیسے وہ جسم اس اصول پر طنزاً مسکرا رہا ہو۔ شہزادہ کی طرف دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی نخلیں مگلابی جسم ابھر ابھر سمٹ کر آپ سے کچھ کہہ رہا ہو۔ جسے سن کر یا محسوس کر کے آپ کا جی چاہتا کہ اٹھ کر کچھ پھوڑ دس یا کسی سے لڑ پڑس۔ اور اگر شہزادہ کی گہری عنابی آنکھیں مسکرا کر دیکھ لیں تو۔۔۔۔۔ مگر شہزادہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اور وہ تسلیم کی کالی کالی موٹی موٹی آنکھوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتی تھی۔

تسلیم شیخ صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور ان کی پہلی بیوی جہاں آرا سے

تھی۔ تسلیم کو دیکھ کر شہزادہ خواہ مخواہ غصہ محسوس کرتی۔ شاید اس لئے کہ تسلیم کی آنکھیں اسے بہت پسند تھیں۔ یا اس لئے کہ وہ آنکھیں اس کے اپنے چہرے پر نہ تھیں۔ یا شاید اس لئے کہ شیخ صاحب تسلیم کے متعلق شہزادہ کی کوئی بات نہ سنتے تھے۔ بہر صورت اس کی کوئی بھی وجہ ہو۔ شہزادہ بات بات پر تسلیم کو ”اندھی ہے کیا۔۔۔۔۔ دکھائی نہیں دیتا“ کہنے کی عادی تھی۔ تسلیم سن کی پی جاتی اور اس کی آنکھیں ان بچے آنسوؤں سے بھیگ کر اور بھی جاذب نظر ہو جاتیں۔ تسلیم کی عمر کوئی سولہ برس کی ہوگی۔ مگر اس کا شباب ان خاموش، منناک آنکھوں نے جذب کر لیا تھا۔ اور اس کے اعضاء ان لطیف حرکات سے ناواقف رہ گئے جن سے شباب اپنا اظہار کرتا ہے۔

البتہ جب کبھی تسلیم کا خالہ زاد بھائی ان کے گھر آ جاتا تو خدا جانے کہاں سے ایک ہلکی سے سرخی آ کر اس کے چہرے پر جھلکی دکھا جاتی۔ اور کرامت کی کسی نہ کسی بات پر اس کے ہونٹ تبسم سے کھل جاتے اور وہ تبسم اس کی آنکھوں میں جا جھلکتا۔ شہزادہ کرامت سے باتیں کرتے ہوئے تسلیم کی وہ حرکات بن دیکھے محسوس کرتی۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ کیا کہنے والی تھی۔ ادھر کرامت کی ہلکی بھی ان کی گفتگو سے بیگانہ رہتیں۔ اور کرامت کی ہلکیوں کو دیکھ کر اور تسلیم کی متبسم آنکھوں کو محسوس کر کے اس کے دل میں ان جانا غصہ کھولنے لگتا۔

پھر جب کرامت چلا جاتا تو شہزادہ یوں محسوس کرتی جیسے اس گھر کی دیواریں بہت اونچی ہوں۔ اندر لوگ یوں چل پھر رہے ہوں جیسے کسی دیوار کے نیچے بھوت اور وہ خود ایک پریشان، نہ ختم ہونے والا خواب ہو۔ اس وقت تسلیم کی منناک آنکھوں کو دیکھ کر اسے ان کا گذشتہ تبسم یاد آ جاتا۔ اور وہ کسی نہ کسی بات پر کہتی۔ ”میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ ابا کا کوٹ بھاڑ دینا۔ مگر تم سنتی ہی نہیں۔۔۔۔۔ اور یہ دیکھو میز پوش پر وجہ لگا کر ناس کر دیا ہے۔ لکھتے وقت تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔“

اس روز کرامت کے جانے کے بعد شہزادہ بہت ہی پریشان تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ لمبی لمبی دیواریں آپس میں ملی جا رہی ہوں۔ وہ دو

ایک مرتبہ اندر گئی باہر آئی اور پھر اندر چلی گئی۔۔۔۔۔ آئینہ دیکھ کر اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس خوبصورت سی تصویر سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو۔ جیسے وہ چہرہ اس کا منہ چڑا رہا ہو۔ پھر وہ باہر صحن میں آ بیٹھی، اس کے سر پر ایک پھیکا سا اداس آسمان پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔۔ بانو کو آتے ہوئے دیکھ کر اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”میں کہتی ہوں بانو، دو روز سے پڑوس میں زبیدہ کے متعلق کیا جھگڑا ہو رہا ہے۔“ اس نے بات شروع کرنے کے لئے کہا۔

”لو بی بی وہ ویسے ہی باتیں بناتی ہے۔ محلے میں کون نہیں جانتا۔۔۔۔۔ میں نے ان آنکھوں سے انہیں ملتے دیکھا ہے۔“

”سچ کہتی ہو۔“ اس نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

”اور تو کیا بی بی مجھے اس سے کوئی لاگ ہے کہ اسے برا کہوں۔“

”مگر بانو۔ لوگوں کو یوں ملنے ملائے کی جرأت کیسے ہوتی ہے۔ توبہ۔ میں تو اس خیال سے ہی کانپ اٹھتی ہوں۔“ اس نے کانپ کر کہا۔

”سچ پوچھو بی بی مجھے تو اس بیچاری پر ترس آتا ہے۔ جوان لڑکی ہے۔ وہ بھلا اپنی جوانی برباد کیوں کرے، یہاں کے وقت ماں باپ کہاں تھے۔ جو اسے اس بڑے کے سر تھوپ دیا۔ اب لوگ خواہ مخواہ اس بیچاری کے سر ہوتے ہیں۔“

”چلو چھوڑو ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو برا کہیں۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں اس مقابل والے مکان میں کون آئے ہیں؟“

”یہی بات تو میں کہنے آئی تھی۔ مگر جو تم برا مانو بی بی تو میں کہوں گی ہی نہیں۔“

”آخر بات کیا ہے؟“ شہزادہ نے متفکر انداز سے پوچھا۔

بانو قریب تر ہو بیٹھی اور بولی ”بات کیا ہونی تھی۔ یہی جو سامنے والے کمرے آئے ہیں نا۔ ایک بڑھیا ہے اور ایک جوان مشنڈا سا لڑکا۔ ابھی کل

بی تو آئے ہیں مگر وہ لڑکا کسی وقت بھی تو کھڑکی سے نہیں سرکا، ہر آتے جاتے کو یوں آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنا۔ چاہے تم کچھ بھی کہو۔ مگر مجھے تو یہ بات پسند نہیں۔ تمہارے گھر میں اللہ رکھے جوان لڑکی ہے۔ اور پھر اس کے کمرے کی کھڑکیاں بھی تو ان کھڑکیوں کے مقابل کھلتی ہیں۔ اس میں بڑی بے پردگی ہے بی بی۔“

”اس میں برا مانتے کی کون سے بات ہے؟“ شہزادہ نے جوش میں کہا۔ ”یہ تو الٹی ہمارے ہی بھلے کی ہے۔ میں کہتی ہوں اگر تمہیں ہمارے برے بھلے کا خیال نہ ہو تو پھر ہو کا کسے۔ تسلیم کے ابا کو تو ان باتوں کا خیال ہی نہیں۔ کئی دفعہ ان سے کہہ چکی ہوں کہ لڑکی اب جوان ہے اس کی کوئی فکر کھیٹے۔ مگر لڑکی کے متعلق تو وہ میری بات تک سننے کے روادار نہیں۔“

”یہ بھی کوئی بات ہے بی بی۔ لو تمہیں لڑکی کا فکر نہ ہو تو کسے ہو۔ آخر ایک روز شادی کرنی ہی ہے۔“ بانو نے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

”تم نہیں جانتی بانو۔“ شہزادہ نے بڑھ کر رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”ویسے دیکھ لو ہر بات میں میں جو چاہوں کروں۔ مگر لڑکی کے متعلق وہ کچھ سنتے ہی نہیں۔ وہ حمید کا جھگڑا ہوا تھا نا۔ تم تو جانتی ہو۔ توبہ۔ لڑکی منہ پر مگر کٹی۔ اور کتنا پاکھنڈ مچایا۔ اس کے ابا تو صاف کہنے لگے کہ میں نے لڑکی پر جھوٹا بہتان لکایا ہے۔“

”مگر بی بی، سچ پوچھو تو تم نے بھی بن سوچے سمجھے بات کہہ دی۔“ بانو آنکھ چمکا کر بولی۔

”مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات میرے ہی سر چڑھے گی۔ میں نے تو ان کے بھلے کی بات کی تھی۔ ورنہ ایک روز جگ ہنسائی ہوتی۔“

بانو قریب تر سرک آئی اور کان میں منہ دے کر کہنے لگی۔ ”تم بھی سیدھی سادی ہو۔ یہ کوئی شرافت کا زمانہ تھوڑا ہی ہے۔ تمہیں تو چاہیئے تھا کہ کوئی خط پکڑ کر ان کے سامنے جا رکھتیں۔“

”یہی تو مجھے افسوس ہے۔ مگر بانو اب تو وہ بات ہاتھ سے گئی۔ شہزادہ

بیٹھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ توبہ ہے! خدا جانے لوگ اسی باتیں کیسے کر لیتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔۔۔ وہ کوٹھے پر چلی گئی۔ سامنے میڈیٹھب سے مکانوں کا تسلسل دیکھ کر اس نے محسوس کیا جیسے زندگی ایک بے معنی سا پھیلاؤ ہو۔ نکل عباسی کا پودا دیکھ کر اس نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ پودا گرد آلود ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے وہ مگدان اٹھا لیا اور نیچے اتر گئی۔

”تسلیم دیکھو خدا جانے کتنے دنوں سے تم نے اسے پانی نہیں دیا۔ بیچارہ سوکھ گیا ہے۔“ تسلیم کی آنکھیں جھک گئیں۔۔۔۔۔ شہزادہ کو یوں چپ دیکھ کر وہ حیران سی ہو رہی تھی۔ شہزادہ نے اس پیڑ پر پانی چھڑکا۔ پھر غسل خانے میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے تسلیم کو آواز دی۔ ”مجھے ذرا اپنا دوپٹہ تو دینا۔ تم جب تک اس کھوٹی سے میرا ہوائی ڈوپٹہ لے لو۔“ تسلیم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔

”میرا دوپٹہ تو میلا ہے۔“ اس نے جھکتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ شہزادہ مسکرا دی۔

شہزادہ نے کمرے میں جا کر اپنے بال سنوارے اور پھر پلنگ پر یوں جا بیٹھی جیسے اسے کوئی کام ہی نہ ہو۔۔۔۔۔ کمرے میں اس نے اندھیرا اندھیرا سا محسوس کیا۔ اس کی ٹکائیں پر پھر کر کھڑکی پر جا ٹھہریں، کھڑکی بند پڑی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔ کھڑکی کھولتے ہوئے اسے مقابل والا مکان یاد آ گیا۔ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ”افوہ میں تو بھول ہی گئی۔۔۔۔۔ مجھ سے تو ایسی بات نہ ہو سکے گی۔۔۔۔۔“ مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔“ کوئی اُس کے دل میں کہہ رہا تھا۔ ”تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو؟“

اس نے کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھولے۔

سامنے کھڑکی میں ایک جوان لڑکا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی۔ گویا یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور فراخ ماتھے پر دو گھٹنے ابرو تے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹھوڑی پکڑے ہوئے وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا۔

”میں بھی کیسی پاگل ہوں۔“ شہزادہ نے کہا اور پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے سامنے گوالن دودھ دودھ رہی تھی۔ خدا جانے کتنی دیر وہ غور سے اس گوالن کو دیکھتی رہی۔ ”عباس۔“ کسی نے گلی سے آواز دی۔ شہزادہ کی نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ لڑکا اٹھ بیٹھا۔ ”کون ہے؟“ اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔۔۔۔۔ شہزادہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب تبسم جھلک گیا۔۔۔۔۔ شہزادہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش میں اس کا دوپٹہ سرک گیا۔

”کیسا ہرا ہرا پودا ہے۔“ شہزادہ نے گل عباسی کے پیڑ کو دیکھ کر کہا۔ ”اب اس میں پھول لگیں گے۔“ اس نے پیار سے ایک سرخ پھول کو چھوا ”گل عباسی۔۔۔۔۔ عباس اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ پھول اس کی انگلیوں کو دبا رہا ہو۔ اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”میں بھی کیسی پاگل ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”اتنا کام پڑا ہے اور میں سب کچھ بھولی جا رہی ہوں۔“

شہزادہ میٹھک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال پریشان تھے۔ آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ اور وہ بیٹھی عباس کا خط پڑھ رہی تھی۔ وہ عباس کا تیسرا خط تھا اس کے بے تکلف الفاظ شہزادہ کے روئیں روئیں میں ناچ رہے تھے، اس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی۔ کہ وہ خط ”میری تسلیم“ سے مخاطب ہے۔ ”میری“ اس کے دل میں میری کا ایک دلچسپ اور نیا مفہوم پیدا ہو رہا تھا ”میری۔۔۔۔۔“

سامنے گل عباسی کے پھول لہرا رہے تھے۔ سرخ سرخ پھول۔ باہر آسمان پر صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی۔ گلی ذور سے دوڑ کر کسی کے آنے کے لئے راستہ بنا رہی تھی۔ مکانوں کی قطاریوں خاموش تھی جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کوئی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ”تمہاری آنکھیں کس قدر شوخ ہیں۔“ کسی کاغذ سے حروف نکل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ اور وہ مسکرا دی۔ ایک ساعت کے لئے اس کے سامنے

وہ اٹھ بیٹھی اور کتنی دیر تک ادھر ادھر گھومتی رہی۔ پھر اندر جا کر اس نے بتی جلائی اور جلدی جلدی اسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھنا چاہتی ہو۔ مگر وہ الفاظ اس کی نس نس میں کھب کر اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ اس نے وہ رقعہ ٹرنک میں پھینک دیا اور خود چارپائی پر لیٹ گئی۔ اپنا دھیان ادھر ادھر لگانے کی کوشش کی۔ مگر اس رقعے کے الفاظ ٹرنک سے نکل نکل کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ ”اچھا تو دو مادہ کے لئے گوجرانوالہ جانا ہے۔۔۔۔۔ دو ماہ۔۔۔۔۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کا شوق ہے۔۔۔۔۔ رات کو دو بجے بیٹھک کے دروازے پر میرا انتظار کس کے۔ یعنی میں وہاں جا کر ان سے ملوں۔ محبت ہے۔ عشق۔ اُف۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوہ۔“ اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ”یہ کیا حماقت ہے۔ جانے دو۔ مجھے کیا ہے۔ میرے پاس اس کے تین خط ہیں۔ کل ہی تسلیم کے ابا کے سامنے رکھ دوں گی۔ کرامت، کرامت سے منہ دھو رکھے۔ اپنے گھر چلی جائے گی تو یہ روز کا قصہ ختم ہو گا۔“ ”غیر آدمیوں سے ملنا۔ توبہ، کیسی بے حیائی کی بات ہے۔“ اس نے ایک جھنجھری لی۔ ”میری تسلیم۔۔۔۔۔“ ”میری۔۔۔۔۔“ اس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔ ”میں بھی کیسی احمق ہوں۔ خواہ مخواہ یہ قصہ چھیڑ بیٹھی۔ آج کل کے لڑکے بھی کیسے نڈر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ زبردستی ہاتھ آپکڑا۔ کیسی منہ پھٹ باتیں کہیں۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ پر کوئی گزشتہ دباؤ تازہ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ توبہ کیسا گرم ہاتھ تھا۔“ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھ کر کہا۔ ”ان لڑکوں کا کیا اعتبار ہے۔ آج کسی کے، کل کسی کے۔ بعد میں خواہ مخواہ بدنام کرتے پھرتے ہیں۔“

اس نے ٹرنک کھولا۔ اس کا ہاتھ زیور کی ڈبیا کی طرف بڑھا ”لاحول ولا“ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ لو یہ قیض عرصے سے ادھوری پڑی ہے۔ اسے سی لوں۔ یونہی نکلے بیٹھنے سے فائدہ۔ نکلا انسان بھی کس کام کا۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ شاید وہ ”نہ سوچنے“ سے ڈرتی تھی۔ اس کی نگاہ گل عباسی کے گلہ ان پر جا پڑی۔ دو کمدائے بوئے پھول لٹک رہے تھے۔ سوکھنے دو۔ صبح و شام ان پودوں کی دیکھ بھال کون کرے۔ اب تو ان کی بہار

ہی ختم ہونے کو ہے۔ اس میں گلاب لگا لیں گے۔ وہ قیض لے کر سینے بیٹھ گئی۔ والان میں تسلیم سو رہی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں تھی ہی نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”یہ رہی آپ کی تسلیم، آکر دل بھر کر دیکھ لیجئے۔“ اور وہ ہنس پڑی۔ گھڑی کی ٹک ٹک اسے یوں سنائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی چکی چل رہی ہو۔ ساڑھے دس بج گئے۔ ”توبہ وقت کیسے گزرتا ہے۔ دو بجے، دو بجے آپ بیٹھک کے دروازے پر کھڑے سوکھیں گے۔ اور آپ کی تسلیم یہاں خراٹے لے رہی ہوگی۔۔۔۔۔ خدا جانے کس کس دروازے پر انتظار کیا ہوگا۔ ان لڑکوں کا کیا اعتبار۔۔۔۔۔ توبہ ہے۔ خدا جانے میں ہانوں کی بات میں کیسے آگئی۔ شکر ہے بات یہیں ختم ہو گئی۔ ورنہ نکل جاتی تو خدا جانے کیا ہوتا۔ اور ابا کو پتہ چل جاتا تو بس کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اللہ نے بچا لیا۔“

”اب سو جاؤں۔“ اس نے ایک انگڑائی لے کر کہا۔ ٹرنک کھول کر اس نے قیض رکھی۔ زیور کو دیکھ کر اس نے اپنے جسم میں ایک سرسراہٹ محسوس کی۔ ”کیسی بے حیائی کی باتیں کہتے ہیں۔ وہ نماز پڑھ کر آئیں تو ابھی ان کو دکھلا دوں اور جھکڑا ختم ہو۔ مگر وہ اپنی پیاری بیٹی کے خلاف ایسی بات کب مانتے لگے۔ اور مان بھی گئے تو مجھے سچا مانتا نامکن ہو گا۔ یہ قصہ شروع سے ہی فضول تھا۔ اور اس تسلیم کے لئے اتنا کچھ کرنا۔ آخر بہتری تو اسی کی ہے نا۔ اپنا گھر جا بسائے گی۔ یہ خط ان کو دکھانا!۔۔۔۔۔ فضول۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔ ان کے وظیفے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ بیٹی ہے ان کی۔ بیابیں یا نہ بیابیں۔ مجھے کیا۔ میری بلا سے۔ میں بھی کیسی پاگل ہوں کہ اس چھوکری کی بہتری کے لئے خود کو خوار کر رہی ہوں۔“

اس نے زیور کی ڈبیا سے وہ کاغذ نکال لئے۔ دیا سلائی لی۔ اور ان کو آگ لگا دی۔ ”بھاڑ میں جائے تسلیم اور اسے چاہئے والے۔“ اور وہ چارپائی پر جا لیٹی۔ دو ایک کروٹیں لیں پھر تین مرتبہ درود شریف پڑھ کر سینے پر پھونک

ماری اور سو گئی ۔

”شہزادہ ، شہزادہ“

اس کی آنکھ کھل گئی ۔ شیخ صاحب اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے ۔ مگر اسے ایسا دکھائی دیا جیسے کوئی ڈراؤنی شکل اسے دبا رہی ہو ۔ وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی ۔

”آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ، شہزادہ“ شیخ صاحب نے کہا ۔ ”ڈر گئی تھی کیا ۔ بیمار تو نہیں تم“

”کچھ بھی نہیں“ ۔ اس نے شیخ صاحب کو پہچان کر کہا ۔

”بار بار میری تسلیم میری تسلیم بڑبڑاتی ہو کیا ہے تمہیں؟“

”مجھے ؟۔۔۔۔۔ میں“

”تم مجھ سے چھپا رہی ہو ۔ تم مجھے معاف کر دو شہزادہ ۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ تمہیں تسلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ یہ میری بھول تھی“

”نہیں آپ ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔“ وہ حیرانی سے ان کا منہ تک رہی تھی ۔

”نہیں شہزادہ ، میں تم سے شرمندہ ہوں ۔ اب تم جانو اور تمہاری بیٹی تسلیم آئندہ سے میں کسی بات میں دخل نہ دوں گا ۔ جو جی چاہے کرو“

شیخ صاحب کے دل میں کئی ایک وہم پیدا ہو رہے تھے ۔ وہ بار بار شہزادہ کی ہنس دیکھ رہے تھے ۔ ان کے ہاتھ اسے تھپک رہے تھے ۔ خدا جانے اسے سلا رہے تھے ۔ یا اپنی دنیا قائم رکھنے کے لئے مضطرب تھے ۔

شہزادہ پھر جاگ اٹھی ۔ جیسے اسے کسی نے جگا دیا ہو ۔ وہ کمرے میں اکیلی پڑی ہوئی تھی ۔ گھڑی کی آواز دنیا بھر میں گونج رہی تھی ۔ ڈیڑھ بجتا تھا ۔ گھڑی کو دیکھ کر اس کے دل میں خیال اٹھنے لگے ۔ ”ہاں دو بجے وہ آئیں گے ۔ میری تسلیم“ ۔ اس نے تسلیم کی طرف دیکھ کر کہا اور مسکرا دی ۔ باہر نگاہ دوڑائی ۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ۔ ”اس اندھیرے میں کون گھر سے نکلتا

ہے ۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں ۔ محبت ۔“ وہ طنزاً مسکرا دی ۔ ”لوگ بھی کس قدر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے اس نے کروٹ لے کر کہا ۔ اور آنکھیں بند کر لیں ۔ اس نے اپنے ہاتھ پر ایک گرم سا دباؤ محسوس کیا ۔ ٹھنک گئی ۔ ہاتھ جھٹک دیا ۔ ”توبہ میں بھی کیسی پاگل ہوں ۔ یہاں کون آ سکتا ہے؟“

گھڑی نے دو بجا دیئے ”لو دو بج گئے ۔ وہ تو اپنے بستر میں سو رہا ہوگا ۔ اور یہ رہی ان کی تسلیم ۔ میں تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہوں“

”اس اندھیرے میں بھلا دو بجے کون نکلتا ہے“ ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ ”تو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا“ ۔ بالکل اس کے دل میں کسی نے کہا ”چلے جا کر دیکھ لو ۔“

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ ”لاحول ولا قوۃ“ ۔ تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو تمہیں کھا جائے گا ۔“ کسی نے اس کے دل میں کہا ۔

اس نے باہر دیکھا ۔ برآمدے میں تسلیم اور اس کے ابا سو رہے تھے ۔ مکان میں بالکل خاموشی تھی ۔ نہ جانے کیوں ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ باہر گئی ، باورچی خانہ میں گئی ۔ پھر واپس آئی ۔ برآمدے سے گزری ۔ مگر تسلیم اور اس کے ابا گہری نیند سو رہے تھے ۔

دفعۃً اسے خیال آیا کہ وہ یوں پریشان کیوں پھر رہی ہے ۔ اس خیال پر وہ بیٹھ گئی ۔ نقابت ، ڈر یا بے بسی کی وجہ سے اس کا دل بیٹھنے لگا ۔ صین اس وقت اس نے دیکھا کہ وہ بے خبری میں کہیں سے ایک تالا اٹھا لائی ہے ۔۔۔۔۔۔ تالا ۔۔۔۔۔۔ وہ مسکرا دی ۔ نہ جانے تالا کیوں اٹھا لائی ہوں ۔۔۔۔۔۔ معاً اس کی نگاہ بیٹھک کے دروازہ کی زنجیر پر جا پڑی ۔۔۔۔۔۔ لگا دو اس کے دل میں کسی نے چپکے سے کہا ۔ اسی وقت اس کا دل پھر سے بیٹھ گیا ۔۔۔۔۔۔ ڈوبنے لگا ۔ اس نے شرم کی ایک رو محسوس کی ۔ ٹن ٹن ۔۔۔۔۔۔ گھڑی نے دو بجائے ۔ جوش کی شدت میں وہ اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔۔۔ منہ لال ہو گیا ۔ گویا غصے کا سہارا لے رہی ہو ۔ آپ ہی آپ بولی ۔ میں کیوں تالا لگا دوں ۔ میں کیوں

سہارا

”صفویہ کیا کر رہی ہے تو۔ دیکھ تو سارا کرتہ ناس کر دیا۔ یاں آ۔ آ ادھر۔۔۔۔۔“ صفیہ نے نانی اماں کی آواز سنی۔ اس کے ناچتے ہوئے پاؤں رک گئے۔ گیت ہوشوں پر خشک ہو گیا۔ بایاں ہاتھ جو وہ جھلا رہی تھی نیچے گر گیا۔ چہرے پر مسرت کی جگہ زردی چھا گئی۔ لیکن اس کے باوجود دایاں ہاتھ شدت سے جھولی کو تھامے رہا۔ بلکہ اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔

”کبھی کسی نے جھولی میں بھی جامن ڈالے ہیں کیا؟“ بڑھیا اس کا شانہ جھنجھوڑ کر بولی۔ ”دیکھ تو سارا کرتہ نیلا ہو رہا ہے۔ جیسے دوات میں ڈبو کر نکالا ہو۔ اب کیا یہ رنگ جائے گا۔ اونہوں؟“۔۔۔۔۔ نانی اماں نے صفویہ کو کندھے سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

”لے ڈال اس میں۔۔۔۔۔“ بڑھیا تھالی کو آگے بڑھا کر بولی۔ ڈال اب۔ ڈال۔۔۔۔۔“ اس نے پھر اسے جھنجھوڑا۔ صفیہ کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور جامن تھالی میں گر گئے۔ ”توبہ کیسی ضدی لڑکی ہے۔“ نانی اماں نے اسے آخری مرتبہ جھنجھوڑ کر تھپڑ دیا۔ جامنوں کو تھالی میں گرتا دیکھ کر صفیہ کے چہرے کا ستاؤ ٹوٹ گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ رونے لگی۔

”بس“ بڑھیا چلائی۔ ”کوئی عقل کی بات کرو تو بنو لگی بسورنے۔ دیکھو تو کیسے کھلا پھاڑ رہی اسے۔ جیسے کسی نے مار مار کر حلال کر دیا ہو۔ توبہ ہے۔ ادھر آ میں تیرا کرتہ اتار دوں۔۔۔۔۔“ نانی اماں نے نرم لہجہ سے اسے بھرمانے کی کوشش کی۔

”اوں۔ ہوں۔۔۔“ صفویہ کڑکڑی ہو گئی۔ بڑھیا نے یہ دیکھ اس کے سر پر پیلا سے ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ”نہ بیٹی۔ ضد نہیں کیا کرتے۔ یہ تو میری

ڈروں کسی سے۔ میری بلا سے۔ کس کی ہمت ہے جو یہاں آئے اور آ بھی جائے تو کیا ہے۔ شیخ صاحب جو ہیں۔ میں کیا اکیلی ہوں یہاں۔ اسے خیال آیا کہ شیخ صاحب کو جگا دے۔ پھر وہ رک گئی۔ خواہ مخواہ جگا دوں۔ کوئی بات بھی ہو۔ بڑا آیا ہے وہ ہماری دیوار پھاند کر آئے والا۔ یہاں آئے تو وہ کروں اس سے کہ پھر بھولے سے ایسی بات کا خیال نہ لائے۔ کیا سمجھا ہے مجھے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تن کر میٹھک کی طرف چل پڑی۔ مذاق سمجھ رکھا ہے اس نے۔ میں کیا کھانڈ کا کھلونا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ میٹھک میں داخل ہو گئی۔

پیاری بیٹی اے - ایسی اچھی اے یہ لڑکی آ میں تیرا کرتہ اتار دوں - لے دیکھ ہو ریا اے نا سارا پنڈا نیلا - میں نے کہا نہ تھا - وہ اس کا کرتہ اتارتے ہوئے بولی - اور پھر پیار سے باتیں کرنے لگی -

”اوں - ہوں - میں اپنے جامن لوں گی“ - صفیہ روٹھے انداز سے بولی -

”نہ میری بچی - زیادہ جامن نہیں کھاتے - اللہ مارے خشک“ -

”اوں کھشک - اور مانی بھائی جو کھاتے ہیں -“

”دفع کر“ - نانی اماں نے ہاتھ چلا کر منہ بنا کر کہا - ”اے تو سر پر پڑھا رکھا ہے - لٹور کہیں کا - اللہ نہ کرے تو اس جیسی ہو - توہ ہے - تو تو میری پیاری بچی ہے نا -“

”اور آپا نے بھی تو کھائے تھے“ - صفو بسورنے لگی -

”بڑی آئی ہے وہ - آپا - لٹکو کہیں کی - تو اس کی بات چھوڑ - لے جا - یہ کرتہ غسل خانے میں رکھ آ - اری تو تنگے پاؤں پھرتی ہے ؟ -“ بڑھیا اس کے پاؤں کی طرف دیکھ کر از سر نو چیخی اور پھر غصے میں ہاتھ سر پر رکھ کر بیٹھ گئی - ”ہائے ری کتنی بار کہا اے تجھے نہ پھرا کر تنگے پاؤں - نہ پھرا کر پر - یہاں کوئی سنے بھی کسی کی - یہاں تو سبھی کانوں میں روٹی ٹھونسے بیٹھے ہیں -“ بڑھیا پاؤں بند بڑڑانے لگی - جیسے گھر کے جملہ لوگوں کو سنا رہی ہو - ”ہزار بار کہا ہے بچے کو تنگے پاؤں نہ رہنے دو - بیمار ہو جاتے ہیں -“ کہاں ہے تیرا جوتا - وہ پھر لڑکی سے مخاطب ہوئی - ”پھر کھو آئی ہے کہیں - توہ کیسی نٹ کھٹ اے یہ چھو کری - اب کون تجھے نت نئے جوڑے خرید کر دے - ابھی چیز لے کر دی - ابھی کم - نہ جانے کرتی کیا اے یہ - جا اب ڈھونڈ اپنا جوڑا - جا -“ بڑھیا نے ایک اس کی کمر میں دی -

”اوں - اوں - میں کہاں سے لاؤں“ - صفو روٹنے لگی

”جہاں رکھا تھا - اور کہاں سے“ -

”میں نے تو غسل خانے میں اتارا تھا“ - ”تو دیکھ وہاں جا کر“ -

”وہاں تو نہیں ہے“ -

”دیکھ بغیر ہی - توہ - کیسے یہاں بنانا آتے ہیں - کیا زمانہ آیا اے - منہ میں دانت نہیں پر باتیں سنو باتیں - جا دیکھ جا کر وہاں - اتنی بڑی ہو گئی اے نہ جانے کب سمجھ آئے گی -

”دیکھ تو آئی ہوں“ - ”تو پھر زمین کھا گئی کیا؟“

”مجھے کیا معلوم“ - ”تجھے نہیں تو ہو گا کسے؟“

”مانی بھائی نے اٹھا لیا ہو گا - وہ اٹھا لیا کرتا ہے میری چیزیں - کل اس نے -“

”بس وہ لڑکا تو گیا ہاتھوں سے“ - بڑھیا نے بات کاٹ کر غصے میں کہا - ”ہزار بار کہا میں نے - بچے کی خبر لو - پر تمہاری ماں تو آنکھیں موند کر میٹھی اے - اب کوئی کیا کرے -“ لو - سنا تم نے -“ وہ ساتھ والے کمرے سے لڑکیوں کی ہنسی سن کر بولی - یہاں تو دن بھر کھی کھی کے سوائے کچھ ہوتا ہی نہیں - جیسے میلے پر آئی ہوئی ہوں - بات کرو تو منہ کو آتی ہیں - کیوں نہ آئیں ماں کی شہ جو ہوئی - اس نے آنکھوں پر ہٹی باندھ رکھی ہے عقل کی بات بتاؤ تو اللہ ماری آزادی - نہ جانے کیا بلا ہے یہ آزادی - آج کل تو ہر کوئی آزادی کی دیوانی ہے نہ شرم نہ حیا - یہ دیکھ لو آزادی کے لچھن -“ ملحقہ کمرے سے دبی دبی ہنسی کی آواز نے اسے پھر ادھر متوجہ کر دیا - ”یہ کیا جوان لڑکیوں کے سے لچھن ہیں ان کے - توہ ہے !!“ معاً اس کی نگاہ رضو پر پڑی - بڑھیا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا - ”اللہ رکھے اک یہی میری بیٹی ہے - بڑی ہو کر ایسی تمیزدار ہوگی دنیا دیکھے گی - ہاں -“ بڑھیا نے صفو کا ماتھا چوما - ”جا میری بنو - اپنا جوتا لے آ - وہیں غسل خانے میں پڑا ہو گا - حمام کے پیچھے - جا میری بیٹی - بڑی پیاری بیٹی ہے یہ -“

رضو کے جانے کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھ کر پرانی جراب ادھیڑنے لگی - اور آپ ہی آپ بڑڑانے لگی - ”چاہے ادھر ہنڈیا جل رہی ہو - لیکن ماں کی لاڈلیاں اپنے کمرے میں مکن میٹھی ہیں - نہ جانے کیا جادو ہے اس کمرے میں -

”بس تجھے تو آپا کی لگن لگی ہے۔ نہ جانے وہاں کیا ملے گا تجھے۔ نہ میٹھی یہاں میٹھ کر پڑھ لے میرے پاس۔“

”اوں تمہارے پاس۔ تمہیں تو آتی ہی نہیں انگریزی۔ آتی ہے کیا؟“

”اے ہے اس میں آنے نہ آنے کی کیا بات ہے۔ تو پڑھیو میں پاس میٹھی تاکا ادھیڑوں کی۔“

صفو نے ہونٹ لٹکائے۔

”بس کوئی بات نہ کرے۔“ نانی نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”بات کی اور بسورنا شروع کر دیا۔ میری طرف سے پڑھ یا نہ پڑھ۔ تیرا ہی بگڑے کا کچھ۔ میرا کیا اے جاہل رہ جائے گی۔ اور آج کل جاہل کو جانتا ہی کون اے۔ پڑھ لے گی۔ تو اللہ اچھا کھرمے کالے جا میٹھی لے آہنی کتلب۔ میری میٹھی کیسی اچھی ہے۔ جا میری بٹو۔“

کتب لا کر صفو پڑھنے لگی اور نانی اماں اطمینان سے تاکا ادھیڑی رہی۔ اگرچہ صفیہ نے ”اے مین رین“ کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لیکن اس کا دھیان کتلب کی طرف نہ تھا۔ بکابیں دیوار پر لٹکے ہوئے کلنڈر پر جمی تھیں۔ اٹھکیاں ورق سے کھیل رہی تھیں۔ اور زبان اے مین رین کا ورد کر رہی تھی۔

ملحقہ کمرے میں سرکوشیاں ہو رہی تھیں۔ دبی دبی باتیں بوتیں پھر دبا دبا قبقبہ سنائی دیتا لیکن نانی اماں کا دھیان کسی اور طرف لگا تھا۔ ہاتھ تاکا ادھیڑنے میں مصروف بکابیں دور۔ نہ جانے کہاں کھوٹی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خوش کن خواب دیکھ رہی ہو۔ منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں کھوٹی کھوٹی سی چمک۔

صفیہ نے بے خبری میں اپنی چوکی گھسیٹی۔ آواز سن کر بڑھیا بیدار ہو گئی۔ صفیہ کی طرف دیکھا اور چڑ کر بولی۔ ”اے ہے ذرا خیال سے پڑھ۔ کتلب کہیں دھیان کہیں۔ غلط تو پڑھنا ہی ہوا۔ کیسی بُری عادت ہے تیری۔“

”ٹھیک تو پڑھ رہی ہوں۔“ صفو بولی۔ ”اور کیسے پڑھوں۔“

”ٹھیک طور پر پڑھے بھی تو۔۔۔۔۔ بڑھیا گھورنے لگی۔

”اوں۔ جیسے تمہیں پتہ ہو“ صفو نے ایک انداز سے کہا۔ ”یہ انگریزی ہے نانی اماں، انگریزی۔۔۔۔۔“ ”معلوم ہے مجھے۔۔۔۔۔؟“ تمہیں آتی تو ہے نہیں۔“

”اے ہے آتی نہیں تو کیا میں سمجھتی بھی نہیں کہ ٹھیک پڑھ رہی ہے تو کہ نہیں۔ ہوں؟ آخر اتنی دیر سے جو سُن رہی ہوں اللہ ماری یہ زبان۔“

”لو میں تو کہہ رہی ہوں۔ اے مین رین۔ اے مین رین یہ کیا غلط ہے؟“

”ہاں ہاں اب تو ٹھیک ہے۔ جب نہ جانے کس طریقہ سے کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ لے اب دیکھ تو اپنی اٹھکیوں کی طرف۔ اس ورق نے کیا بگاڑا ہے ترا جو اے مروڑ رہی ہے۔“

”میں کیا توڑ رہی ہوں اسے۔ میں تو۔۔۔۔۔“

”بس اب لگی یہاں بنانے۔۔۔۔۔“ ”یہاں کہاں کرتی ہوں۔ نانی اماں۔“

”بہت زبان کھل گئی ہے تری۔۔۔۔۔“ ”اوں۔ اوں۔“

”اوں ہوں کیا ہوا۔ وہ جلال میں بولی۔۔۔۔۔“ ”اور یہ ٹانگیں کیوں جھلانے لگی تو۔ تو بہ۔ نہ جانے کب عقل آئے گی تجھے۔ سنا نہیں تو نے۔“ بڑھیا نے اے شانے سے پکڑ کر جھنجھوٹا۔ نہ جھلا ٹانگیں۔ کہہ جو رہی ہوں۔ سیدھی ہو کر بیٹھ۔۔۔۔۔ اور یہ پاگل۔۔۔۔۔ اے ہے سب خاک میں لت پت کر دیا۔ صفو۔۔۔۔۔“

”اے ہے۔“ نانی اماں میٹھی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھیں۔ ”نادان بچی اے نہ جانے کہاں بھیج دیا ہے اسے۔ انہیں تو ذرا خیال نہیں آتا۔ لو اور سنو لڑکیوں کو بھی میلے میں بھیجتا ہے کوئی آج تک تو سننے میں نہ آیا تھا۔ لیکن اب تو ایسا الٹا زمانہ آیا ہے کہ تو بہ میری۔ میں پوچھتی ہوں یہاں نہیں آئی بسنت

کیا۔ جو چچا کے ہاں بھیج دیا صفو کو۔ یہیں دیکھ لیتی یہ اللہ ماری پتنگیں۔ یہاں بھی تو گننے میں نہیں آتیں۔ نہ جانے وہاں کیا خاص بات تھی اللہ رکھے جوان ہونے کو آئی ہے۔ جوان لڑکیاں اچھی لگتی ہیں کوٹھے پھلانگتی ہوئی۔ پوچھے کوئی۔ لیکن اس گھر میں کوئی سنے بھی کسی کی۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے ان کی سمجھ کو اور بھیجنا ہی تھا تو دوپہر کو بھیج دیتے دو گھڑی دیکھ کر چلی آتی واپس۔ اتنی سویرے لڑکی کو بھیج دینا۔۔۔۔۔ اللہ نہ کرے ٹھنڈ لگ جائے تو۔ نہ جانے کب آئے گی وہ۔ نہ کھانا نہ پینا۔ اور پھر کوئی اسے نگاہ میں رکھے نہ رکھے۔ اللہ نہ کرے اگر کوٹھے سے گر پڑے تو۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔ ڈور سے ہاتھ کاٹ لے۔ ہاں۔ اسے سمجھ بھی ہو۔ بالکل بچی ہے وہ تو۔ اور اللہ ماری یہ ڈور۔ کم بخت دھار کی طرح تیز ہوتی ہے۔ لڑکی کی ماں نے تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ پھر مجھے کیا پڑی۔ میری بلا سے۔ غصے میں وہ دیوار کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ جیسے دیوار سے روٹھ گئی ہو۔ صادق اور عقیلہ باتیں کرتی ہوئی پاس سے گزریں تو اس کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو گئی۔ اس نے صادق کو آواز دی۔ ”صادق“ لیکن دونوں لڑکیاں باتوں میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہوں نے بڑھیا کی آواز نہ سنی۔ ”صادق“ وہ جلال میں بولی۔ ”کون ہے؟“ عقیلہ نے کہا۔ ”کوئی بھی نہیں نانی اماں ہے۔“ صادق نے جواب دیا۔ اور وہ ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئیں۔

نانی اماں کا ہاتھ تیزی سے چلنے لگا۔ ”کانوں میں روئی ٹھونسے پھرتی ہیں دڑک دڑک۔ ادھر سے ادھر۔ دڑک دڑک ادھر سے ادھر اور کیا۔ چاہے کسی کا کلا خشک ہو جائے آوازیں دے دے کر۔ کیا مجال جو انہیں خبر ہو۔ کیا زمانہ آیا اسے۔ مزاج ہی ٹھکانے نہیں ان کے۔ توبہ یہ آج کل کی لڑکیاں!!“

مانی نے بڑھیا کے پاس آکر زور سے سیٹی بچائی تو وہ چونک پڑی۔ مانی کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ ”ڈر گئی نانی اماں ڈر گئی۔“ ”چل دور ہو۔“ وہ غرائی۔ ”شیطان کہیں کا۔ وہاں جا کر بجا اسے اپنی ماں کے کان میں۔ ہاں۔ شرم نہیں آتی۔ مجھ سے مذاق کرتے ہوئے۔“ مانی بڑھیا کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اور سیٹی بچانے لگا۔ ”میں کہتی ہوں۔ جائے گا تو یا کہوں تیری اماں

سے؟“ مانی نے جواب میں ایک قبچہ لکھیا۔ ”اچھا ٹھہر تو“ بڑھیا نے دھمکی دی لیکن مانی نے چلے جانے کی بجائے جھک کر اس کے کان کے قریب سیٹی بچانی شروع کر دی۔ ”اچھا پڑا بچا۔“ وہ بولی۔ ”اپنے کان پہرے کرے گا۔ میرا کیا لے گا۔“ اور وہ شدت سے تاکا ادھیڑ نے میں مصروف ہو گئی۔

جب صادق کمرے سے باہر نکلی تو بڑھیا اس پر برس پڑی۔ ”میں کہتی ہوں۔ تم نے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے کیا۔۔۔۔۔؟“

”ہم نے تو کوئی نہیں ٹھونسی۔ تمہارے ہی مزاج ٹھکانے نہیں نانی اماں۔“

”میرے مزاج۔ کیوں کیا ہے مجھے؟ صبح سے چلا رہی ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”تمہاری تو عادت ہو گئی ہے نانی۔“ صادق یہ کہہ کر چلی گئی۔

”صفو کی ماں ذرا یہاں تو آ۔ بات سن کر جا میری۔“ اس نے اسے آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔۔۔۔۔ ”ابھی آئی اماں۔“ اس نے جواب دیا اور بغل والے کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہ دیکھ کر مانی دبے پاؤں آیا اور پیچھے کھڑا ہو کر بڑھیا کا منہ چڑانے لگا۔

بڑھیا نے حسرت بھری نگاہ اٹھائی۔ چاروں طرف دیکھا اور ایک لمبی آہ بھر کر کام میں لگ گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ چہرے پر جھریاں یوں سمٹ گئیں۔ جیسے بے بسی کی لہریں چل رہی ہوں۔ کمرے میں لڑکیاں اپنی ماں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ باہر دیوان خانے میں قبچہ گونج رہے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں مرغیاں چوں چوں کر رہی تھیں۔ چھتوں پر بچے شور مچا رہے تھے۔ وہ کانا۔ اس گہما گہمی کے باوجود وہ محسوس کر رہی تھی جیسے کوسوں دور تک ویرانی چھائی ہوئی ہو۔ جیسے صور پھنک جانے کے بعد لوگ نفسا نفسی میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ارد گرد کی دنیا کو اس سے کوئی تعلق نہ ہو اور اس کی اپنی دنیا بے سہارا اوندھی پڑی ہو۔ اس نے تاکا ادھیڑنا بند کر دیا اور گٹھڑی سی بن کر کھٹولے پر دھوپ میں لیٹ گئی۔ دیوان خانے میں مردوں کے قبچہ بے معنی سنائی دیتے تھے۔ ملحقہ کمرے میں لڑکیوں

کی کھی کھی ارد گرد کی اداسی کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔

”اماں“۔۔۔۔۔ صفو کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ اٹھ بیٹھی۔ ”تو آگئی بیٹی۔ آمیرے لال۔ آجا“۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ”اے ہے اتنی دیر رہی وہاں۔ جی لگ گیا تیرا۔ میری طرف دیکھ۔ منہ کیوں نیچے کر رکھا ہے تو نے۔ خیر تو ہے۔ بولتی نہیں۔“

صفو کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر نانی اماں نے اے گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ ”تو تو میری جان کا سہارا ہے۔ میں تو صرف حیرے لئے جیتی ہوں۔“

لیڈی ڈاکٹر

”ہوں۔ نروس بریک ڈاؤن“۔ ڈاکٹر نے میرا بیان سن کر کہا۔ ”کب سے آنکھ لگی ہے۔“

”پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہوں۔ جگانا مناسب نہیں۔ میں انتظار کروں گا۔ کوئی محبت و جنت کا قضیہ تو نہیں۔“

”معلوم نہیں۔“ میں مسکرایا۔ ”غالبا جوان ہے۔ خوش شکل ہے۔ جاذب نظر ہے۔“

”گذشتہ ہسٹری کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر انداز سے پوچھنے لگے۔

”دیکھئے نا۔“ میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو اپنی پوزیشن سمجھاتا ہوں۔“ ”نہیں نہیں“ وہ چلائے۔ ”آپ کی پوزیشن نہیں چاہئے۔ مریض کی گذشتہ ہسٹری۔“

”دیکھئے نا ڈاکٹر صاحب۔ بات یہ ہے کہ میں مریض سے قطعی ناواقف ہوں۔“

”بالکل نہیں جانتے آپ۔۔۔۔۔ ہوں۔“ انہوں نے بے معنی تھکاہٹ سے میری طرف دیکھا۔ ”جوان ہے۔ خوش شکل ہے۔“ اس سے پہلے بھی تو آپ کے پاس آتی جاتی ہوگی۔“

”ڈاکٹر صاحب !!! میں چلایا۔“ غضب کر رہے ہیں آپ۔“

”لیکن جب تک آپ مجھے حالت نہ بتائیں گے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔“

”تہیں۔“ وہ خشک انداز سے کہنے لگا۔ ”لیکن میری ذاتی رائے ہے کہ

”ہاں۔ اس کے ہوشوں پر شرارت آمیز ہنسی کھیلنے لگی۔ ”ایسے حالات

میں صرف عشق ہو سکتا ہے عشق ، محبت نہیں ہو سکتی۔“

”یہ محبت اور عشق کا فرق بھی خوب رہا۔ اگر بُرا نہ مانتیں آپ تو میں بھی سنوں وہ واقعہ۔“

”میری زندگی کا عجیب ترین واقعہ ہے“ اس نے کرسی اُگ کے قریب تر سرکاتے ہوئے کہا۔ ”عجیب ترین واقعہ۔“

”تو آپ بھی اس مرض کے ہاتھوں لاچار ہو چکے ہیں کبھی۔“ میں گنگنایا۔

”اب تک ہوں۔“ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

”سچ؟“ واقعی۔ دو سال ہو چکے ہیں دو سال۔“ اس نے ایک آہ بھری۔

ہنسنے ہنستے میری منظر مریضہ پر جا پڑی۔ رضائی ہلتی دیکھ کر خیال ہوا کہ وہ جاگ پڑی ہے۔ ڈاکٹر سے کہنے والا ہی تھا کہ وہ بولا۔ ”وہ ایک عجیب ترین واقعہ تھا۔“ اس عجیب ترین واقعہ کو سننے کے لئے میں بے تاب ہو رہا تھا اگر میں ڈاکٹر کی توجہ مریضہ کی طرف دلا دیتا تو اس واقعہ کو سننے کا کوئی امکان نہ رہتا۔ اس لئے خاموش ہو رہا۔

”ان دنوں میں رضا پور ڈسپنسری سے تبدیل ہو کر سیالکوٹ جا رہا تھا۔ رضا پور ایک چھوٹی سی ڈسپنسری ہے۔ جہاں میں انچارج کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ لیکن سیالکوٹ کے ہسپتال میں مجھے سب انچارج کے فرائض سرانجام دینے تھے۔ قدرتی بات تھی مجھے یہ تبدیلی پسند نہ تھی سب انچارج کی حیثیت کون پسند کرتا ہے۔ رضا پور میں سب سے پہلے تھانے دار نے مجھ سے اس کا ذکر کیا بولا۔ ڈاکٹر صاحب۔ سیالکوٹ میں جا کر مزے کرو گے نا۔“

”مزے؟“ میں نے حیرانی سے دہرایا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ جیسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ ”آخر بات کیا ہے“ میں نے پوچھا۔ کہنے لگا۔ ”اس ظالم پر تو سارا سیالکوٹ مرتا ہے۔ اُف کیا چیز ہے۔ وہ لاکھوں میں ایک ہے۔“ ”بھئی وہ کون ہے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہی لیڈی ڈاکٹر۔“ وہ مسکرایا۔ ”جو زنانے ہسپتال میں ہے وہاں۔“

لیکن ڈاکٹر ایسی شاطر ہے وہ کہ کسی کے ہتھے نہیں چڑھتی۔ اچھا بھئی سیالکوٹ جا کر ہمیں یاد رکھنا۔“

پھر کولہرہ ٹو اسکپٹر آ گئے۔ وداع ہوتے وقت وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے۔ ”برا نہ مانتے لیکن میرا فرض ہے کہ میں آپ کو آگاہ کر دوں۔“ ”فرمائیے“ ملک صاحب میں نے کہا۔ ملک صاحب اپنے طبعی بزرگمانہ انداز سے کہنے لگے۔ ”نزہت سے بچ کر رہئے گا۔ وہاں سیالکوٹ میں۔“ نزہت ، کون ملک صاحب۔ وہی لیڈی ڈاکٹر۔ برے بھلے کے متعلق تو خدا جانتا ہے لیکن وہ بدنام ہے۔ ان کی باتیں سن کر میں نے اس موضوع میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ میں نے کہا۔ ”کیا وہ آوارہ ہے؟“ ”نہیں نہیں۔“ وہ بولے۔ ”آوارہ نہیں۔“ پھر میں نے پوچھا۔ ”جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بری عورت نہیں لیکن چونکہ خوبصورت ہے۔ اس لئے ہر ایک کی نظر پر چڑھی ہوئی ہے ، کیا افسر ، کیا چپراسی ، ذرا خیال رکھنا۔“

سیالکوٹ دفتر میں پہنچا تو ایک کلرک بولا۔ ”لو جی یہ آگئے ہسپتال کے سب چارج“ ہیڈ کلرک نے اپنی عینک سنواری اور مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی سائنسدان کسی نئی قسم کے جرثومہ کو دیکھتا ہے۔ کونے میں سے ایک صاحب چلائے۔ ”بھئی واہ یہ جوڑا ٹھیک رہے گا۔ پہلا سب انچارج تو انچارج کی طرح قابل پنشن تھا۔“ لالہ جی ہنسنے۔ ”یہ تو بہت چست معلوم ہوتے ہیں۔ ہم تو جب مانیں گے۔ لالہ جی کلرک بولا۔ جب ان کی چستی کا نتیجہ نکلے گا۔ خیر بھئی جوڑا برابر کا ہے۔“ دوسرا گنگنایا جی نہیں۔ تیسرا مجھے گھور کر کہنے لگا۔ وہ تو بجلی ہے بجلی۔“ اس بات پر میں سمجھ گیا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کا ذکر کر رہے تھے۔

لیڈی ڈاکٹر کے متعلق باتیں سن کر میرے دل میں اسے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ جب کبھی اکیلا بیٹھا ہوتا مجھے اس کا خیال آ جاتا ، ایک خوبصورت مجسمہ میری آنکھوں تلے آکھڑا ہوتا۔ یا میرے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتا یا برآمدے میں ٹہلنے لگتا اور میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ غرضیکہ میں نے لوگوں کی باتیں سن سن کر اکیلے میں اندازے لگا لگا کر اپنی خواہشات کو بھرما بھرما کر دل

ہی دل میں لیڈی ڈاکٹر سے عشق پیدا کر لیا۔ اب میں بے تابی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب میں اسے دیکھنے والا تھا۔ آخر ایک روز ہمیں ملنا ہی تھا نا۔ کب تک سامنے نہ آئے گی۔ لیکن سیالکوٹ آئے مجھے پانچ دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اسے ملنے کا موقع نہ ملا تھا۔

میری زندگی میں ایک عجیب بات واقعہ ہوتی رہی ہے۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا جب کبھی میرے دل میں کسی خاص عورت کی محبت یا آرزو پیدا ہوتی ہے عین اس وقت کوئی اجنبی عورت خواہ مخواہ میری زندگی میں داخل ہو جاتی ہے اور ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ نہ میں ادھر کا رہتا ہوں اور نہ ادھر کا۔

”عجیب بات ہے۔“ میں نے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ”بار بار ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔ ایک دن شام کے وقت میں صحن میں ٹہل رہا تھا۔ گھر کی بتیاں تک روشن نہ کی تھیں۔ نہ جانے کس خیال میں کھویا ہوا تھا میں۔ مختصر سا کوارٹر تھا وہ۔ درحقیقت میرا مکان کوارٹر نہ تھا بلکہ مریضوں کا ایک کوارٹر مجھے دے دیا گیا تھا۔ اس کا ایک دروازہ ہسپتال میں کھلتا تھا اور دوسرا باہر گلی میں۔“

”مریض کہاں ہے؟“ سُریلی آواز میرے کان میں پڑی۔ شام کے دھندلکے میں میرے روبرو دروازے میں ایک چٹا سفید چہرا جھللا رہا تھا۔ نہ جانے اسے دیکھ کر مجھے کیا ہوا۔ میں نے سمجھا شگفتہ آگئی ہے۔ شگفتہ میری ایک پرانی آشنا ہے۔ کبھی کبھی وہ یونہی اطلاع دے بغیر آجایا کرتی ہے اور دو ایک دن میرے پاس ٹھہر کر چلی جاتی ہے۔ ہر بار وہ نیا بہانہ بنا کر آتی ہے۔ کبھی مریضہ بن کر اور کبھی ڈاکٹر۔ اسے دیکھ کر میں سمجھا کہ وہ شگفتہ ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ میں نے کہا۔ کون مریض؟“

”میرا مصعب ہے“ وہ بولی۔ ”اس وقت تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ شگفتہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارا مطلب“ اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے میں نے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا۔ ”صاحب؟“ وہ چلائی ”میں بتاتی ہوں آپ کو۔“ تم کیا بتاؤ گی میں خود بتاتا ہوں تمہیں۔“ اس نے دو ایک

ہلکی ہلکی چیخیں ماریں۔ لیکن میں قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”کس غلط فہمی میں ہیں آپ۔“ وہ چلائی ”لو سب غلط فہمیاں دور کئے دیتا ہوں۔“ میں نے اسے بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی تو میں نے بتی جلائی اور کہنے لگا۔ ”لو اب کہو مزاج کیسے ہیں۔“ اسے۔ اسے دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ شگفتہ کی جگہ ایک اجنبی عورت میرے بستر پر گھٹری بنی پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ ”مجھے بے حد افسوس ہے۔ معاف کیجیئے گا۔“ میں نے معذرت کی لیکن معاً مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے اسے ذرا بھی احساس دلایا کہ میں نادیم ہوں یا ڈر گیا ہوں تو وہ پھر جائے گی۔ ڈاکٹر بن کر عورت کی نفسیات سے کچھ واقفیت ہو ہی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

یعنی آپ کا مطلب ہے اگر آپ گھبرا جاتے تو۔۔۔۔۔ میں نے اپنا خیال الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

بالکل۔ وہ بولا اگر میں گھبرا جاتا تو وہ پھر جاتی۔ اف۔ کس قدر بدنامی ہوتی۔

”عجیب بات ہے“ میں نے کہا۔

بالکل حقیقت پر مبنی وہ بولا۔ اتنی زیادتی کر دینے کے بعد یہ کہنا کہ مجھ سے غلطی یا بھول ہوئی۔ عورت کی بے عزتی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اسے اپنانے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ تو صاحب میں نے جھٹ کہہ دیا۔ ان پیاری گستاخیوں کا افسوس نہیں مجھے بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ اتنی جلدی بتی جلا دی۔

”عجیب انسان ہیں آپ۔“ غصے سے اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔

”تم بھی تو عجیب ترین عورت ہو۔“ عجیب اور بے حد پیاری“ میں نے پید سے اس کی طرف دیکھا۔

اب میں کیا کہوں۔ اس کے ہوشوں پر موہوم مسکراہٹ جھلکی۔

”کہنے کی ضرورت بھی ہو“ میں چلایا۔ ”نیچی نظر سے دیکھنا ہی کافی ہے۔“

اور بیشتر اس کے کہ وہ اپنا کھویا ہوا توازن حاصل کر سکے۔ میں نے اسے پھر سے چومنا شروع کر دیا۔ پہلے تو اس نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن صاحب میری گرفت بھی تو ڈوبتے کی گرفت کے مصداق تھی۔

”ڈوبتے کی گرفت؟“ میں نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”ہاں صاحب“ وہ مسکرایا۔ اگر وہ ذرا بھی بگڑ جاتی تو کس قدر بدنامی ہوتی۔ میرا سارا کیریر برباد ہو جاتا۔ یقینی طور پر وہ مجھے نوکری سے برطرف کر دیتے۔ ہاں۔ تو جلدی ہی اس کی کوششیں ڈھیلی پڑ گئیں حتیٰ کہ اس نے مکمل طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا۔

پھر تو آپ نے من مانی کی ہوگی۔“ میں مسکرا دیا۔

”قطعی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”اسے یوں پا کر میں نے اس سے دوستی کا ٹھنی شروع کر دی۔“

”وہ کیسے؟“

”ہاتھیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ عورت کو بھرمالنے کے لئے باتوں سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

”آپ نے تو میری سدھ بدھ مار دی ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”سدھ بدھ تو مجھے نہیں رہی جب سے تمہیں دیکھا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں مجھے کیا ہے؟“ وہ بولی ”مجھے کیا معلوم“ میں نے کہا ”دیکھ لو ایک پڑھا لکھا سمجھدار ڈاکٹر ایک جھلک سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔“ ”ایسا معلوم ہوتا ہے۔“ جیسے آٹا فہمی سے ایسا کیا ہے“ وہ بولی۔

”غلط فہمی۔“ میں انجان بن گیا۔ ”شاید آپ کسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ جب میں آئی آپ مجھے میں وہ ہوں۔“

”پنگلی“ میں ہنسنے لگا۔ ”ساری عمر تمہارے انتظار میں بیٹھا رہا۔ آخر تم آہی گئیں۔ میں جانتا تھا تم آؤ گی۔ ضرور آؤ گی۔ اس میں غلط فہمی کا سوال

پیدا ہی نہیں ہوتا۔“

”اچھا“ وہ مسکرانے لگی، ”بھلا بتاؤ تو میں کون ہوں۔“ اس بات پر میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا مجھے نام سے کیا واسطہ، مجھے تو تم سے غرض ہے چاہے تم کوئی بھی ہو تم میری ہو۔ تم وہ ہو جس کا مجھے انتظار تھا۔ یہ سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی ”بات بنانا ختم ہے آپ پر“ میں نے کہا ہاں بشرطیکہ تم سن رہی ہو۔ اچھا اسی بات پر اپنا نام بتا دو۔ نام کا کیا ہے۔ وہ بولی۔ ”آپ کو تو مجھ سے غرض ہے۔ چاہے کسی نام سے بلا لیا کرو۔“ تو تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔“ میں نے بگڑ کر کہا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر چلائی۔ ناراض نہ ہو جانا کہیں۔ میرا نام صندلی ہے۔ ”صندلی“ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”فی البدیہہ معلوم ہوتا ہے۔ خوب نام تجویز کیا ہے۔“ قسم ہے جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا۔“ وہ بولی۔ پھر تو میں بڑا آدمی ہوں۔“ میں نے بن کر کہا ”نہ جانے کیا ہیں آپ“ وہ مسکرائی۔ لیکن ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے آپ کے سامنے کوئی پردہ ٹھہر نہیں سکتا۔ صندلی میرا نام نہیں لیکن بالین میں مجھے سب ہی صندلی کہا کرتے تھے۔“ اس کی آنکھوں میں صداقت جھلک رہی تھی۔ بس صاحب مختصر یہ ہے کہ میں نے ایسی ایسی باتیں کیں کہ دھاک بٹھا دی۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی تو میں محسوس کرنے لگتا کہ اس کے انداز میں تفریح کی جگہ سنجیدگی کی جھلک ہے۔ لیکن یہ تو صرف وقت کٹی کر رہا تھا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر خاموش ہو گیا اور اٹھ بیٹھی میں اٹھتے ہوئے شعلوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ گویا ان شعلوں میں اسے کسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

میری نظر مریضہ پر جا پڑی۔ یقینی طور پر وہ جاگ رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی لیکن اب وہ بائیں پہلو پر پڑی تھی۔ منہ ہماری طرف تھا۔ اگرچہ لحاف سے ڈھانپا ہوا تھا۔ شاید وہ بھی ڈاکٹر کی آپ بیتی سن رہی تھی، یا ویسے ہی لیٹی ہوئی ہو۔

”اگر وہ اس قدر خوبصورت اور پیاری نہ ہوتی تو شاید میں اس کی محبت کا

دم بھرنے لگتا“ ڈاکٹر گنگنایا ۔

خوبصورت نہ ہوتی تو ؟“ میں چونکا ۔

”ہاں“ وہ بولا ”ہم رسمی خوبصورتی یا حسن کی ہلکی سی جھلک سے متاثر ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اگر کسی کا حسن آنکھیں خیرہ کر دینے والا ہو تو دل میں جھجک اور بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایسے حسن کو ہم شک کی نظر سے دیکھتے ہیں یا شاید اس کی وجہ وہ انوکھی ملاقات ہو ۔ بہر حال میرے دل میں صندلی کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے ۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ ایک عام عورت ہو ۔ میرا مطلب ہے ہر ہاتھ کا کھونا ۔ حالانکہ اس کی باتیں اور انداز نہایت مہذب اور پاکیزہ تھے لیکن اس کا حسن ۔ اُف

حسن بذات خود ایک بد قسمتی ہے ایک افتاد ۔ اگر میں صندلی کو دور سے دیکھتا ۔ چند دن اسے پاس سے دیکھنے کی آرزو لے پھرتا ۔ چند مرتبہ وہ بے پروائی اور بے نیازی سے میرے پاس سے گذر جاتی تو میرے دل میں اس کے لئے عزت پیدا ہو جاتی ۔ اور شاید میں لیڈی ڈاکٹر کا ضبط چھوڑ دیتا ۔ لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا ۔ صندلی کو دیکھ کر مجھے لیڈی ڈاکٹر کا خیال آ جاتا ۔ کس قدر مختلف تھی ۔ خاموش اور شرمیلی ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اس روز تک میرے روبرو نہ آئی تھی ۔ اس کے بعد صندلی اکثر مجھ سے ملنے کے لئے آجایا کرتی تھی ۔ عموماً وہ شام کو آتی اور آدھی رات کے قریب لوٹ جاتی ۔ پہلے دن تو اس بات کی ضرورت تھی کہ میں اس سے اظہار محبت کروں ۔ لیکن اس کے بعد مجھے ایسا ڈھونگ رچانے میں کوئی دلچسپی نہ رہی ۔ تو صاحب اس کے آنے پر ہم دونوں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو جاتے وہ چائے بناتی اور ہم دونوں مل کر چائے پیتے اور ریڈیو سنتے یا تاش کھیلتے ۔ اور نہیں تو رضائی میں بیٹھ کر کہیں ہانکتے رہتے شاید آپ سمجھتے ہوں کہ میں بات چھپا رہا ہوں ۔ ڈاکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا ”نہیں نہیں“ میں نے کہا ”اس کی کیا ضرورت ہے ۔ ویسے بات کر رہا ہوں ۔“ وہ بولا ۔ ”اس کے حسن کو دیکھ کر ولولہ تو اٹھتا تھا لیکن اس کا یوں آپ ہی آپ آجانا ۔ مجھ سے بے تکلف لڑتے جھکڑتے رہنا ۔

اس کا بے پناہ حسن یہ سب باتیں مجھے روک لیتی تھیں ۔ نہ جانے کون ہے ۔ کہاں سے آتی ہے ۔ شاید یہ اس کا کام ہو ہزاروں خیال دل میں آتے۔“

”سچ“ ! ایک گھٹی ہوئی ہچکی کی آواز آئی ۔ ڈاکٹر چونکا اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا ۔ مریض بے حس و حرکت پڑی تھی ۔ ”کیسی آواز تھی“ وہ بولا ۔ معلوم نہیں“ میں نے کہا ۔ عین اس وقت باہر بجلی کڑکی ۔ پہاڑوں میں وہ کڑک گونجی ۔ گونجتی چلتی گئی ۔ اُف کس قدر طوفانی رات ہے ۔ ڈاکٹر بولا ۔ ہوا کس قدر زوروں پر ہے“ میں نے کہا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑیاں طوفان کی زد میں آکر کراہ رہی ہوں“ ہوں وہ خاموش ہو گیا ۔ مریض کا لحاف آہستہ آہستہ ہل رہا تھا ۔ جیسے اس کے تلے لہریں اٹھ رہی ہوں ۔ عجیب سی حرکت ہے ۔ میں نے سوچا ۔ جیسے وہ ہچکولے کھا رہی تھی ۔ ہاں تو وہ لیڈی ڈاکٹر کیا ہوئی میں نے آہ بھر کر کہا ۔ ”آپ تو صندلی کے بھنور میں پھنس گئے ۔“

”ہاں“ ڈاکٹر مسکرایا ۔ ”واقعی وہ ایک بھنور تھی ایک حسین پراسرار بھنور جس میں بالآخر ہم دونوں ڈوب گئے ۔ لیڈی ڈاکٹر اور میں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے کہ قدرت نے التلماً وہ بھنور میری راہ میں پیدا کر دیا تھا ۔ اُف کس قدر زبردست چیز ہے قدرت ۔ ڈاکٹر نے آہ بھری ۔ نہ جانے وہ اس کی آہ تھی جو کمرے میں چاروں طرف گونجنے لگی یا باہر کی ہوا تھی ۔ بہر حال میں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کمرے کا کونہ کونہ آہیں بھر رہا تھا ۔ ”لیڈی ڈاکٹر سے ملنے کا اتفاق تو ہوا ہو گا ؟“ میں نے بات چلانے کی خاطر کہا ۔

”ہاں“ وہ مسکرایا ”جلد ہی وہ دن آگیا ۔ اس روز مجھے اپریشن کرنا تھا ۔ یا شاید کوئی اور بات تھی ، میں بھاکا بھاکا اپریشن روم کی طرف جا رہا تھا ۔ راہ میں مجھے کپاؤنڈر ملا ۔ میں نے ویسے ہی اس سے پوچھا“۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں کیا“ ”جی نہیں“ وہ بولا ۔ ”اندر لیڈی ڈاکٹر ہیں“۔ لیڈی ڈاکٹر ؟ میں اور بھی تیز چلنے لگا ۔ ابھی دروازے کے پاس ہی تھا کہ اندر سے ایک چپڑاسی آیا کہنے لگا ”ڈاکٹر صاحب آپ یہیں ٹھہریئے ذرا“۔ کیوں“ میں نے حیرانی سے پوچھا ۔ ”اندر

”کچھ دیر کے بعد چپڑاسی واپس لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

لوگوں کے منہ سے لیڈی ڈاکٹر کی تعریفیں سن سن کر میں پہلے ہی شوق سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے میرے روبرو آنے سے انکار کرنے پر وہ شوق و فتنہ عشق کے درجہ تک پہنچ گیا۔ آپ جانتے ہیں۔ نیا نیا عشق ہو تو دلچسپ باتیں نہیں سوچتیں۔ پہلے تو صندلی مجھ سے خاموشی کی وجہ پوچھتی رہی۔ پھر وہ بھی بار بار چپ ہو رہی۔ مجھے خیال آیا کہ صندلی کو راز بتا کر اس سے کام لوں تو صاحب میں نے تمام واقعہ اسے سنا دیا۔ وہ ہنسی کھلکھلا کر ہنسی۔ بولی مرد بھی عجیب مخلوق ہے جو سامنے آجائے اس سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں جو چھپ جائے اس سے عشق لگا لیتے ہیں ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے بات کرنے

یہ دیا ہے انہوں نے وہ بولا۔ صاحب نے کانفد کی طرف دیکھا۔ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی۔ پڑھو ڈاکٹر کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ پڑھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ استغفے بھیجا ہے صاحب۔ مجھے دو وہ غصے میں چلایا اور پن نکال کر اس پر لکھنے لگے۔ چپراسی بیڈ کلرک سے بولو۔ یہ استغفے آج ہی منظور کیا جائے۔ لیڈی ڈاکٹر کو اطلاع کر دی جائے۔

”اس واقعہ پر میرے رہے سہے اوسان بھی کھو گئے ڈاکٹر نے بات جاری کی۔ اس نے میری خاطر استغفے دے دیا ہے۔ سارے ہسپتال میں باتیں ہو رہی تھیں۔ میری طرف اٹھکیاں اٹھتیں۔ میری آمد پر لوگ چپ ہو جاتے۔ اک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھتے ہوں گے۔ نہ جانے وہ مجھ سے چھپنے پر مصر کیوں تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی۔ شاید وہ مجھے جانتی ہو۔ لیکن چھپنے سے مطلب۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا میں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کون ہے میں نے پوچھا۔ لڑکے نے ایک بڑا سا لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ کہنے لگا۔ یہ انہوں نے بھیجا ہے یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں سمجھا کوئی سرکاری کانفد ہو گا۔ اندر آیا بجلی جلائی۔ لفافے میں اس کی تصویر تھی۔ نیچے انگریزی میں لکھا تھا۔ گڈ بائی ڈاکٹر رینٹ۔“

کیا لیڈی ڈاکٹر کی تصویر تھی وہ؟ میں نے پوچھا۔

”ہاں“ ڈاکٹر ہنسا۔ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تصور!“

”خوبصورت تھی کیا۔“

”خوبصورت“ وہ پھر قہقہہ مار کر ہنسا بے حد خوبصورت تصور تھی صرف

اس کا منہ پرلی طرف تھا۔

”پرلی طرف تھا؟“ میں نے پوچھا۔

میں نے کئی بار اس کا چہرہ دیکھنے کی امید پر تصویر کو الٹایا بھی۔ یہ حماقت کی انتہا تھی وہ پھر ہنسنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”یہ بھی عجب مذاق تھا اس کا۔ وہ تصویر اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں نے اسے

انٹارچ کر کے کمرے میں لٹکا رکھا ہے۔ یار دوست اسے دیکھ کر ہنسا کرتے ہیں۔ چوڑے شانے پتلی کمر اور لمبی چوٹی اس تحفہ کو دیکھ کر ہنسی نہ رکتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد صندلی آگئی۔ اس روز اسے دیکھ کر مجھے غصہ نہ آیا۔ لیڈی ڈاکٹر تو ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ چلو چند دن کی دل لگی ہی سہی۔

قرب ہی کوئی کراہنے لگا۔ میں نے مریضہ کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی پڑی تھی۔ منہ کی طرف سے رضائی کا کونہ اوپر اٹھا رکھا تھا۔

”ڈاکٹر نے پھر بات جاری کی بولا ”اس روز میں نے صندلی کو بھرمانے کی بہت کوششیں کیں، لیکن ظالم بے حد سنجیدہ تھی۔ کہنے لگی اس کے بعد شاید میں آپ سے مل نہ سکوں۔ ابھی تو تمہاری ضرورت پڑی ہے مجھے، میں نے اسے چھیڑا۔ اچھا اس نے آہ بھری، میں ایک ضروری بات پوچھنے آئی ہوں وہ بولی۔ بصد شوق میں نے ہنس کر کہا۔ نہیں وہ کہنے لگی۔ مذاق نہیں ڈاکٹر بے حد اہم بات ہے۔ اہم اور سنجیدہ۔ کہو میں نے منہ پکا کر لیا۔ بولی۔ میرے جیون ساتھی بنو گے؟ میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اور کس کا جیون ساتھی بنوں گا۔ وہ شیطان تو استغفے دے کر چلی گئی۔ میں جانتی ہوں آپ کو اس سے محبت ہے۔ وہ بولی۔ ہاں مہا میری شوخی معدوم ہو گئی۔ مجھے اس سے محبت ہے لیکن تم سے بھی تو ہے۔ ”ڈاکٹر“ وہ غصہ میں چلائی، کیا تم مجھے بازاری عورت سمجھتے ہو؟ تم میری توہین کر رہے ہو۔“ میرا مطلب ہے۔“ مجھے پھر شرارت سوجھی، میں جانتا ہوں تمہارا مطلب“ میں نے اسے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور اندر لے جا کر چومنے لگا۔ ڈاکٹر، وہ چلائی۔ اس کی چیخ سن کر میں گھبرا گیا۔ محبت نہیں نہ سہی لیکن میری توہین نہ کرو۔“ پھر جو میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے میری طرف ایک گتا سا پھینکا۔ گتے کا سخت کونہ میری آنکھ میں چبھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے آنکھ کھولی تو وہ جا چکی تھی۔ میرے سامنے ایک تصویر پڑی ہوئی تھی۔ نیچے اردو میں لکھا تھا بصد شوق و محبت۔ صندلی۔ بالکل ویسا ہی انداز۔

چہرہ کہہ رہا تھا میں نے پوچھا۔

میری طرف - وہ مسکرایا - ”بس وہ آخری دن تھا - اس کے بعد وہ بھی کہیں کم ہو گئی -“

”آپ نے صندلی کا پتہ نہ لکایا -“ میں نے پوچھا -

”اس کی کیا ضرورت تھی -“ وہ طنزاً مسکرایا -

”اس کی تصویر؟“ میں نے پوچھا -

”اس کی تصویر اب بھی میرے پاس ہے -“ وہ ہنسا دونوں تصویروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے - جیسے وہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوں - غالباً ایک ہی فوٹو گرافر سے کھینچوائی ہوں گی - یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا -

دفعۃً مریضہ کے بستر میں حرکت ہوئی - مریضہ اٹھ کر بیٹھ گئی - سیاہ لحاف میں اس کا سرخ و سفید چہرہ چمک رہا تھا - نہ جانے کیسے - میرے منہ سے ان جانے میں نکلا - ”صندلی کی تصویر بھی انٹارچ کروائی ہوگی -“ اونہوں - ڈاکٹر بولا - ”اے نہیں لٹکایا -“ وہ منہ بنا کر ہنسا - ”میرا گھر پان والے کی دوکان نہیں -“ قریب ہی سے ایک چیخ سنائی دی - مریضہ دھم سے بستر پر گر پڑی - کون تھا ڈاکٹر چلایا - ”ہائے کتنی مصیبت ہے -“ نجی کمرے میں داخل ہو کر بولی - اسے دیکھ کر ہم اٹھ بیٹھے - ”اوہ ڈاکٹر“ نجی بولی - ”آپ باہر چلئے ذرا -“ ڈاکٹر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا - ”اچھا میں جاتا ہوں -“ وہ گنگنایا - تم ہو نجی مریضہ کو دیکھ کر خوشی سے چلائی - مریضہ نے ہونٹوں پر اٹھکی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا - باہر بجلی کی روشنی میں ڈاکٹر اپنا مینڈیک سنبھالے واپس جا رہا تھا - مریضہ کی ٹکائیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں - کال آنسو سے تر تھے - پاس نجی حیران کھڑی تھی - باہر ہوا ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر چیخ رہی تھی ، کراہ رہی تھی -

بیارا پالتو

سلیمان نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا - وہ بوٹ سمیت کافیچ پر پڑا تھا - سر تلے دو ایک گدیاں رکھی تھیں - کمر تلے کاغذ اور کتابیں پڑی تھیں - فرش پر چابجا کتابوں اور کاغذوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں - پرلی طرف دو تین کرسیاں گڈ بڑ ہو رہی تھیں - دو ایک کرسیوں پر کپڑے پڑے تھے - ایک کرسی پر گدیاں یوں نیچے اوپر رکھی تھیں جیسے چنگیر میں روٹیاں -

اس نے کافیچ پر پڑے پڑے کمرے کا جائزہ لیا - اور اس گہما گہمی کو دیکھ کر مسکرا دیا پھر ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے اپنے نوکر کو آواز دی - - - - -
تھے - - - - - او تھے !“ پھر کوئی فلمی دُھن گنگناتے ہوئے وہ مٹھو کو دیکھنے میں کھو گیا - مٹھو سفید رنگ کا جانور تھا - جو اس نے کسی دوست سے بطور تحفہ لیا تھا - اگرچہ اسے جانور رکھنے کا شوق نہ تھا - لیکن اس سفید طوطے کو دیکھ کر اس کا دل لپکا گیا - اس نے طوطے کے لئے ایک پنجرہ بنوایا - جو کسی ہلکی ، سفید اور چمکیلی دھات کا تھا - اس روز سے وہ اور مٹھو ساتھی بن گئے - اکثر بیٹھے بٹھائے وہ مٹھو کو دیکھنے یا اس سے باتیں کرنے لگتا - مصیبت یہ تھی کہ مٹھو کو بولنا نہ آتا تھا - وہ کبھی کبھار چیخ مار کر سلیمان کی توجہ مبذول کر لیتا اور پھر خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنا کرتا - سلیمان کو طوطے کا نہ بولنا اور بھی پسند تھا - کیونکہ اس نے کئی ایک ایسے طوطے دیکھے تھے جو ہر وقت میاں مٹھو چلا چلا کر سر کھا جاتے تھے - اس طوطے کی سب سے بڑی خصوصیت جو سلیمان کو پسند تھی یہ تھی کہ اس کی نشست کے انداز تھے - کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی کسی فدا سفر کی طرح سوچ بچار میں کھویا ہوا - یا اسے بیٹھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا گویا وہ ابھی اٹھ کر ناپختہ لگے گا - اس کا ہر انداز اظہار کیفیت سے بھرا ہوا تھا - سلیمان اکثر کہا کرتا - یہ طوطا تو آل لیکسپریشن ہے - اس کے علاوہ اس کے ہر انداز

نشست میں جلی کیفیت موجود رہتی۔ شاید اسی لئے طوطے کو دیکھنے سے اس کے دل میں راحت سی پیدا ہوتی۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا گویا یہ طوطا صحیح معنوں میں جی رہا ہے۔ اس بات پر وہ اپنے آپ میں وہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور شاید اسی لئے ہر سے خوش باش رہنے کا عادی ہو گیا۔

ایک موٹا سا آدمی کشتی نما ٹوپی سنبھالتا ہوا دروازے میں آکر ہوا۔
”ہجور!۔۔۔۔۔!“

وہ چونک پڑا اور تھے کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر بولا۔ ”ہوں۔۔۔۔۔ کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”ہجور!“ تھے نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ ”ہجور، آپ ہی نے بلایا ہے۔“

”اوہ!“ وہ مسکرایا۔ ”اچھا تو میں نے بلایا ہے۔ ہوں۔ اچھا، اچھا۔۔۔۔۔ تو چائے ہی بنا لاؤ۔“

”چائے۔“ تھے نے سر کھجاتے ہوئے کہا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ”ابھی تو تین بجے ہیں۔“

”ہوں۔ تو تین بجے ہیں“ سلیمان نے مسکرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔
”ابھی تین بجے ہیں۔ اچھا تو ہم سوا تین بجے چائے پیئیں گے۔ جاؤ۔“

تھا سر کھجاتا ہوا باہر نکل گیا۔ سلیمان کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی ریاست کا نواب ہو۔

سلمان کی طبیعت ہلاکی آزاد تھی۔ رسموں، تکلفوں اور اصولوں سے بے نیاز۔ متواتر آٹھ سال اس نے آزاد فضا میں گزارے تھے، چھ بورڈنگ میں جب وہ کلچ میں پڑھتا تھا اور دو سال جب سے وہ پروفیسر تھا۔ اب اسے صرف کلچ جانے کی پابندی تھی۔ وہ بھی کڑی نہیں۔ کیونکہ پڑھانا یا نہ پڑھانا اس کی اپنی مرضی پر منحصر تھا اور طبعاً اس کی طبیعت میں پابندی کا احساس قطعی مفقود تھا۔ جب جی چاہتا پڑھنے لگ جاتا۔ کئی کئی دن وہ مسلسل مطالعہ کرتا رہتا۔ صبح و

شام، صبح و شام اور بعض اوقات ہفتوں کتاب تک نہ کھولتا۔ چائے پینے پر طبیعت آجاتی تو دن میں چھ چھ چائے دایاں پی جاتا۔

وہ چائے چائے دانیوں کے حساب سے پیا کرتا تھا۔ اسے ایسی آزاد زندگی بے حد پیاری تھی۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار یہ بے مہار آزادی اس کے دل کے کسی کونے میں کھٹکتی۔ اس کا جی چاہتا کہ گھر میں کوئی ایسا فرد ہو جو اس کی زندگی میں دلچسپی پیدا کرے جس کی رفاقت اس کی آزادی کو اور بھی رنگین بنا دے۔ بسا اوقات جب اس کا احساس آزادی مسرت کی لہریں بن کر اس پر چھایا ہوتا تو اس کے دل کے کسی کونے میں ایک ٹھیس سی اٹھتی اور اسے پریشان کر دیتی۔ وہ اس مبہم احساس کو بھلانے کے لئے اٹھ بیٹھتا۔ کتاب کھول لیتا یا ویسے ہی کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ وردہ منھو سے باتیں کرنے میں لگ جاتا اور ان جانے تھے کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتا۔ کچھ گنگناتا اور جب تھا چائے کا ٹرے لے کر آتا تو حیران ہو کر پوچھتا۔ ”ہیں، ابھی سے چائے۔ ابھی تو تین بجے ہیں۔۔۔۔۔ تھے کی پریشانی دیکھ کر اسے ہنسی آجاتی۔ اور ساتھ ہی یاد آتا کہ اس نے خود ہی چائے کے لئے آواز دی تھی۔ ”اوہ“ وہ مسکراتا۔ ”اچھا تھے میز پر رکھ دو۔“

اس روز وہ خاص طور پر خوش تھا کیونکہ زندگی میں پہلی مرتبہ اماں اس کے پاس رہنے کے لئے آرہی تھی۔ اس سے پہلے اس نے کئی مرتبہ اماں سے منت کی تھی کہ اس کے ساتھ رہے لیکن بوڑھی ماں کو اتنی دور جانا گوارا نہ ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے سلیمان کے لئے ایک خوب صورت سی دلہن لائے۔ اسے چاؤ چونچلے سے یہاں ہے۔ اس لئے وہ اکیلی اتنی دور جانے پر رضامند نہ ہوئی تھی۔ سلیمان کو فی الحال یہاں کرنا منظور نہ تھا کیونکہ اس کے پاس روپیہ نہ تھا اور اماں دھوم دھڑاکے کا یہاں کرنا چاہتی تھی۔ قرض لینا اسے گوارا نہ ہوا اور روپیہ جمع کرنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ ان حالات میں وہ یہاں نہ کر سکتا تھا ویسے بھی اسے یہاں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس روز وہ خوش تھا کہ ماں نے اس کے ساتھ رہنا منظور کر لیا ہے۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اماں کے آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح بیٹے کو یہاں پر مائل کرے اور اس مقصد کے لئے کچھ

اتار کر کسی کرسی پر پھینک دے۔ پڑا پڑا ٹوپنی کھونٹی پر ٹانگے کی کوشش کرے اور اس دوران میں تھے کو آوازیں دے اور کھانا نہ تیار ہونے پر برا بھلا کہے۔ اور طوطے سے کھانا تیار نہ ہونے کی شکایت کرے۔ نہا کر کھانا کھاتے ہوئے اسے خوشی تو ہوئی لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں افسوس سا ہوا کہ اس کا بہترین مشغلہ اس سے چھین لیا گیا ہے۔

”بس؟“ اماں نے اسے کھانے سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”کیوں بیٹا؟ تمہیں بھوک نہیں لگتی کیا؟“ اسکی آواز میں فکر نمایاں تھا۔ ”صبح چائے کے ساتھ بھی تم نے کچھ نہ کھایا تھا“۔ ایک نظر اس نے اماں کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ چونکہ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس روز اس نے بڑی اشتہا سے کھانا کھایا تھا اور یقیناً روز سے زیادہ کھا گیا تھا۔ پھر وہ مسکرا پڑا۔ اماں کے چہرے پر تشویش اور پریشانی دیکھ کر اسے ہنسی آگئی۔

”میں جانوں تمہیں پسند نہیں آیا“۔ اماں نے دکھ بھری آواز سے کہا۔ اس کی آواز لجاجت بھری تھی ”کیوں بیٹے؟“

”نہیں اماں!“۔ وہ ہنسا۔ ”میں تو روز پھوٹ پھوٹ کر کھاتا ہوں اور آج بھی میں نے ٹھونس کر کھایا ہے۔ تم تو ویسے ہی گھبرا گئی ہو اماں“۔ اس نے ہنستے ہوئے اٹھ کر کھلی کی اور پھر کرسی پر آ بیٹھا۔

اس روز کمرے میں ہر چیز سلیقے سے پڑی تھی۔ تمام کتابیں الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیاں مناسب مقامات پر لگی تھیں۔ میزوں پر دھلے ہوئے میز پوش پڑے تھے۔ نہ جانے کیوں خواہ مخواہ اسے محسوس ہوا گویا وہ کتابیں بیکار ہو چکی ہوں اور مر جانے کے بعد الماری میں دفن کر دی گئی ہوں اور وہ کمرے کے جان پڑا ہو۔ اگرچہ کمرے کی صفائی پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے رہ رہ کر خیال آتا گویا وہ کمرے کی غیر آدمی کا ہو۔ جیسے سلیمان سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس نے اٹھ کر الماری سے ایک کتاب اٹھالی۔ گویا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا واقعی وہ کتابیں مر چکی تھیں یا ابھی جان باقی تھی۔ تفریحاً وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکا۔ سامنے اماں یوں کھڑی تھی۔ گویا حزن و ملال کی ایک تصویر منگی ہو۔

”بیٹے؟“ ماں نے منت سے کہا۔ ”ابھی کھانا کھایا ہے۔ ذرا آرام کر لے۔ اللہ ماری یہ کتابیں، تو نے تو پڑھ پڑھ کر جان ہلکان کر لی ہے۔ آرام کر لے ذرا بیٹا“۔

وہ زبردستی مسکرایا۔ ”تو کیا بے آرامی کر رہا ہوں۔ میں اماں؟“ ”نہیں بیٹے۔ میں کہہ رہی تھی۔ ابھی تو سر کھپا کر آیا ہے۔ اور پھر کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام تو بہت ضروری ہوا بیٹے، ویسے تو آپ سیانا ہے۔ اللہ رکھے سمجھدار ہے۔ جو جی چاہے کر۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی“۔ اماں کی آنکھوں میں آنسو ڈھبڈھا آئے۔ ”دیکھو تو کیسا لاغر ہو گیا ہے۔ نہ کھانا، نہ پینا اور کام ہی کام۔ اللہ ماری یہ کتابیں“۔ اس نے الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ایک دو ہوں تو بھی ہے۔ یہاں تو پورا کباڑ خانہ اترا ہوا ہے“۔

”واہ اماں!“ وہ ہنسا۔ ”میں کیا دہلا پتلا ہوں یہ دیکھو“ اس نے چھاتی کے بٹن کھول کر اماں کو دکھایا۔ دیکھا اماں پورا پہلوان بن گیا ہوں۔ کھایا پینا اور پھر سارا دن بیٹھا مکھیاں مارتا رہا۔ اور یہ کتابیں، میں کیا پڑھتا ہوں انہیں ہونہہ! اماں تو تو ویسے ہی فکر کرتی رہتی ہے“۔

”آخر یہ کتابیں پڑھی ہی ہوں گی نا“۔ وہ بولی۔ ”اب نہیں پڑھتا تو کیا ہوا۔ یہ ایک ہی کتاب سر پہرا دینے کے لئے کافی ہے۔ تو بہ کتنی بڑی بڑی ہیں۔ لچھا بیٹا ذرا آرام کر لے۔ دو گھڑی سو لے تو کیا حرج ہے تیرا؟ اماں نے مزید لجاجت سے کہا۔

سلیمان بادل ناخواست اٹھ کر چارپائی پر جا پڑا اس روز گویا اس کی آنکھیں نیند سے قطعی خالی تھیں۔ لیکن اس خیال پر کہ اماں کا دل نہ دکھے وہ چپ چاپ پڑ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اماں کو کس قدر خیال ہے میرا۔ بے چاری ہر گھڑی میری

بہتری سوچتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود چوری چوری اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلے۔ مٹھو سے باتیں کرے یا کچھ گنگنائے۔ اور پھر تھے سے چائے کا مذاق رہے۔ لیکن اس روز تو کمرے کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کتابیں ادھر ادھر پھیلا دے۔ کرسیاں گڈمڈ کر دے۔ حتیٰ کہ وہ کمرہ اس کا اپنا کمرہ ہو جائے۔

نہ جانے کب تک وہ انہی خیالات میں کھویا پڑا رہا۔ پھر اماں کی آواز سن کر چونک پڑا۔۔۔۔۔ ”کیوں بیٹے؟ تمہیں نیند نہیں آتی۔ پنکھا کروں؟“

”نہیں نہیں اماں۔ پنکھا کرنے کی ضرورت بھی ہو۔ میں تو بالکل آرام کر رہا ہوں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تم کیوں فکر کرتی ہو؟“

”میں فکر تو نہیں کرتی بیٹے۔ ویسے ہی دیکھنے آئی تھی کہ تم سو گئے ہو یا نہیں۔ بس اب میں جاتی ہوں تم آرام کرو“ جاتے ہوئے وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی۔ ”ناحق بے آرام کیا میں نے؟“

اماں کے چلے جانے کے بعد اس نے محسوس کیا گویا وہ بیمار ہو۔ اماں کے انداز کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی مہلک بیماری کا شکار ہو اور صرف اماں اس بحید کو جانتی ہو۔ اس خیال پر وہ مسکرا دیا۔ ”یہ عورتیں! وہ ہنسا انہیں بچوں اور بیماروں سے کس قدر لگاؤ ہوتا ہے۔ کسی بے بس کی دیکھ بھال کرنے سے کس قدر دلچسپی ہوتی ہے۔“

”تم جاگتے ہو بیٹا۔“ نہ جانے کتنی دیر کے بعد وہ پھر آگئی۔ ”چائے منگواؤں۔“

”کیوں نہیں اماں۔“ سلیمان اٹھ بیٹھا۔ ”میں تو چائے کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔“

چائے پیتے ہوئے اماں نے غور سے سلیمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ سلیمان اس محبت اور بے بسی کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ نہ جانے اماں اس قدر دکھی اور بے بس کیوں نظر آتی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اماں کی زندگی میں بڑے بڑے

مصائب آئے تھے۔ وہ کثرت ازدواج کی شکار تھی۔ لیکن ان باتوں کے باوجود اب تو ایک عرصہ سے اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ کسی کی محتاج نہ تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا موجودہ غم گزشتہ زندگی کی تمام تر تکلیفوں سے زیادہ جانگسل ہو۔ سلیمان کا شادی سے یوں بے نیاز ہونا اس کے لئے سب سے بڑا دکھ تھا۔ چونکہ اس کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں بیٹے کو آباد دیکھے۔ بہر حال اس وقت وہ اماں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے خواہ مخواہ اپنی توجہ ادھر ادھر مبذول کرنے میں لگ گیا۔ تاکہ ماں کی طرف نہ دیکھ سکے۔

جب سلیمان نے تیسرا پیالہ بنایا تو اماں بولی۔ ”بیٹے تو بُرا نہ مانے تو کہوں۔ اتنی چاء پینا اچھا نہیں۔ یہ اللہ ماری۔۔۔۔۔“ اس نے چاء دانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”بدن کی ساری چربی پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ دیکھ تو منہ پر ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں تیرے۔“

”نہیں اماں۔“ وہ خواہ مخواہ چڑ گیا۔ ”میں تو چھ چھ پیالے پی جاتا ہوں۔ اس میں کیا ہے؟“

”اچھا بیٹے!“ ماں نے آہ بھر کر کہا۔ ”جیسے تیری خوشی۔ پر یہ گرمی خشکی تیرے لئے اچھی نہیں۔ آگے تو آپ سمجھدار ہے۔ میں تو پاگل ہوں جو تجھے ایسی بات کہہ دیتی ہوں۔“ اس وقت اس کی آواز پٹے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی بھیگی سنائی دے رہی تھی۔ سلیمان نے زبردستی طوطے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ان تاثرات سے بچنا چاہتا تھا جو اماں کی آواز اور جھریوں بھرا چہرہ پیدا کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے باورچیخانے سے تڑاخ کی آواز آئی۔ ”دیکھنا تو اماں نہ جانے تجھے نے کیا توڑ دیا ہے۔“ سلیمان نے بے پروائی سے کہا۔

اماں کے جانے کے بعد دو ایک ساعت وہ خاموش بیٹھا رہا۔ گویا چائے کا پیالہ پینے سے ہچکچا رہا ہو۔ پھر اس نے دل کڑا کیا اور چائے کا تیسرا پیالہ غٹ غٹ پی گیا۔ اور پھر جلدی جلدی چوتھا بنا کر معصوم انداز سے یوں طوطے کو دیکھنا شروع کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”لو بیٹے۔“ اماں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ تھوڑا سا مکھن کھا

”ہاں ہاں بیٹے“۔ وہ بولی۔ ذرا ٹہل آؤ۔ لیکن جلدی لوٹ آنا ورنہ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔

کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا سے اسے چڑ تھی۔ وہ یہ بت سن کر اکثر طنزاً ہنسا کرتا۔ یہ عورتیں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا کا پاکھنڈ کرنا خوب جانتی ہیں وہ اپنے دوست سے اکثر کہا کرتا تھا مسٹر نعیم، سیکم صاحبہ کا مطلب ہے کہ تم آوارہ گردی نہ کرو۔ ورنہ کھانے کا کیا ہے۔ ٹھنڈا ہو بھی جائے تو کیا کھایا نہیں جاتا۔ اور سچ پوچھو مسٹر نعیم تو سیکم صاحبہ کا تمہیں آوارہ گردی سے بچانے کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ تم جلدی واپس آ کر سیکم گردی کر سکو۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا تو محض بہانہ ہے۔ مطلب تو صرف اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ پھر وہ ہنس پڑتا۔ ”کس قدر چالاک ہیں یہ عورتیں!“ اور وہ ہنسے جاتا لیکن اس روز اماں کی بات پر وہ ہنس بھی نہ سکا۔ سیکم گردی کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو اماں تھی۔ اس کی اپنی ماں۔

عام طور پر وہ سیر کا عادی نہ تھا۔ اگرچہ سینما جایا کرتا تھا۔ لیکن سیر۔۔۔۔۔ سیر سے اسے نفرت تھی اگر اس کا کوئی دوست اس سے پوچھتا مسٹر سلیمان تم سیر کو نہیں جاتے تو وہ ہنس پڑتا اور کہتا۔ ”بھئی میرے لئے تو صرف یہ احساس ہی ضروری ہے کہ میں ایسے شہر میں رہتا ہوں جہاں اتنی سیر کاہیں ہیں۔ جب اور جہاں چاہوں جا سکتا ہوں لیکن چل کر جانا۔۔۔۔۔ نہ بھئی کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو یا جیسے وہ کسی خطرے سے بھاگا جا رہا تھا۔ لیکن جلد ہی وہ مکھن کا ٹکڑا اس کے پیٹ میں گرہ سی بن گیا اور ناچار اسے واپس آنا پڑا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“ اماں نے پوچھا۔ ”طبیعت تو ابھی ہے تم اس قدر چپ کیوں ہو؟ سلیمان“۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اماں“۔ وہ بولا اور نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑا۔ ”دیکھا، میں نے کہا تھا نا“۔ اماں دیکھی انداز سے بولی۔ ”یہ اللہ ماری چائے، بس چائے چائے نہ کھانا نہ پینا۔ تمہارے دشمنوں کی انتہیاں سوکھ

لو۔“

”مکھن؟“ سلیمان نے تعجب سے اماں کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹے“۔ وہ بولی۔ ”چائے کی زیادتی کے ساتھ ساتھ مکھن کا استعمال کر لیا کرو تو اچھا رہے۔ ورنہ یہ کم بخت تو انتہیاں سکھا دیتی ہے۔ رس بسکٹ پر لگاؤ کے یا ٹوسٹ بنا دوں“۔ اس وقت نہ جانے سلیمان کو وہ مکھن کا ٹکڑا اس قدر ڈراؤنا کیوں دکھائی دیا۔ اس کی طبیعت ماش کرنے لگی۔

”لیکن اماں۔۔۔۔۔“ وہ رک گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ اماں کا دل دکھانا اچھا نہیں۔ بادل ناخواستہ اس نے وہ ٹکڑا اماں کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ ”نہیں اماں ٹوسٹ کی کیا ضرورت ہے“۔ اس نے تھوڑا سا مکھن رس بسکٹ پر لگا لیا۔

”ڈرا سا اور لگا لو“۔ اماں نے لجاجت سے کہا۔ ”تو سے مکھن سے کیا ہو گا؟“ سلیمان نے محسوس کیا۔ گویا اس وقت دنیا کی چیزوں میں صرف ایک مکھن ہی تھا۔ جس کے خلاف اسے اس قدر نفرت تھی۔ اسے پسینہ آگیا۔ پھر اسے سوچھی۔ چھری یوں چلائی گویا مکھن لگا رہا ہو لیکن سارے کا سارا مکھن چھری پر اتر آیا۔ جھٹ چھری والے ہاتھ کو میز پر چھپا کر وہ لیک نوالے ہی میں بسکٹ بھل گیا۔ ماں سامنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی معصوم کو دھوکا دیا ہو۔ گویا وہ چور ہو۔ ایسی معمولی سی بات پر فریب کرنا، یہ احساس اس کی نظر میں اس کے جرم کو اور بھی قبیح بنا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ وہ بودا آدمی ہے۔ اس میں اتنی جرات بھی نہیں کہ ماں سے دل کی بات کہہ دے۔

چائے کے بعد اس نے محسوس کیا گویا وہ ٹوسٹ اس کے منہ سے میں پھول پھول کر آفت بنا رہا ہو۔ پہلے تو وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ مگر وہ اس مکھن کے ٹکڑے کو بھلا نہ سکا۔ پھر ماں سے کہنے لگا۔ ”اماں میں ذرا سیر کر آؤں“۔

گنتی میں اور کیا ہے گرمی اور خشکی۔

سلیمان کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ چپ چاپ پڑا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اماں کی باتیں نہ سنے۔ لیکن وہ باتیں اس کے سر میں ہتھوڑے کی طرح بچ رہی تھیں۔ پھر اسے سو جھی بولا۔ ”اماں! تم فضول فکر کرتی ہو ادھر نعیم کی ہاں چلا گیا تھا انہوں نے کھانا کھلا دیا۔“

”اوہ یہ بات ہے۔“ اماں بولی۔ ”تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ خیر کھانے کی بات نہیں۔ مجھے تیری طبیعت اچھی نہیں دکھتی بیٹا۔“

اگلے دن سویرے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اماں سرہانے کھڑی ہے۔ اور ہاتھ سے اس کا ماتھا محسوس کر رہی ہے۔ پہلے تو وہ چونک پڑا۔ پھر انگڑائیاں لینے لگا۔

”نہ بیٹے اٹھو نہیں۔“ وہ بولی۔ ”یہیں ناشتہ لے آتی ہوں میں۔ دیکھو تو سر تنور کی طرح تپ رہا ہے۔ میں جانتی تھی تیری طبیعت اچھی نہیں۔“ اس نے ایک بار پھر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ”نہ جانے کتنا بخار ہے۔“

”نہیں اماں!“ اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی ”ویسے ہی گرمی ہے۔ بخار کہاں“ اس کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر حسب معمول کمرے میں گھومے۔ کوئی کتاب اٹھا کر یہاں سے وہاں رکھ دے۔ طوطے سے گپ شپ اڑائے لیکن اماں کے خیال سے وہ پڑا رہا۔ اگرچہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا چارپائی پر کاٹے بچھے ہوئے ہوں۔

ماں ناشتہ لینے گئی تو وہ طوطے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو پنجرے میں بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت اُسے طوطے کی انداز نشست میں وہ جالی کیفیت نظر نہ آئی۔ اس کے اطمینان بھرے انداز کو دیکھ کر پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ شاید وہ اطمینان محض ظاہری ہو۔ اسے خواہ مخواہ شک پڑنے لگا۔ کہ طوطا خوش نہیں ہے۔

جب وہ چائے کا پیالہ ہٹانے لگا تو ماں لجاجت سے بولی۔ ”بیٹے سلیمان!

آج چائے نہ پیتو تو کیا ہرج ہے۔ دودھ کا پیالہ پی لو۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تمہاری

”دودھ“ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ اسے دودھ سے چڑ تھی۔ اس روز تو اس کا جی چاہتا تھا کہ سارا کا سارا پاٹ دودھ بغیر پی جائے۔ اتفاق سے اماں تک لینے چلی گئی۔ سلیمان نے قبوہ کا پیالہ بھرا اور اسے طشتری میں ڈال کر پی گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی منہ پونچھا۔ اور یوں بیٹھ گیا گویا اماں کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر آپ ہی آپ وہ غصے میں آ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اماں آ جائے تو اس کے روبرو دودھ ڈالے بغیر ایک پیالہ بنا کر پئے لیکن اماں کو دیکھ کر اس نے اپنی خواہش دہالی اور از سر نو اماں کا دل نہ دکھانے کا ارادہ کر لیا۔

ابھی اس نے مرہ کی پھانک اٹھائی ہی تھی کہ وہ بولی۔ ”نہ بیٹے! آج میں تمہیں یہ کھانے نہ دوں گی۔ اللہ مارا کس قدر کھٹا ہے اور تم ساری رات کھانستے رہے ہو۔“

سلیمان شرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا پھر وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔ ”اچھا بیٹے جیسی تمہاری مرضی۔ اگر ضرور ہی پیننی ہے چائے تو دودھ زیادہ ڈال لو۔ خشکی نہ کرے۔“ اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ”دودھ ہی سے چائے کی خشکی کم ہو جاتی ہے۔ لیکن آج کل تو لوگ چائے میں دودھ ڈالنا حرام سمجھنے لگے ہیں۔ بس بوند گرائی رنگ بھی نہیں بدلتا اور پی گئے۔“

سلیمان ہنسنے لگا۔ لیکن اس کی ہنسی وحشت بھری سنائی دے رہی تھی۔ ”اچھا اماں۔“ وہ بولا۔ ”یہ دیکھو“ اور آدھ پیالہ دودھ سے بھر لیا۔ ”ٹھیک ہے نا؟“

”جیسے تیری مرضی بیٹے!“ ماں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تو تیری خوشی میں خوش ہوں۔ میرا کیا ہے؟“

”نہیں نہیں“ وہ چلایا۔ ”ٹھیک تو کہہ رہی ہو تم۔ میں کیا بچہ ہوں جو استا بھی نہیں سمجھتا کہ چائے خشکی کرتی ہے اور کھانسی کی وجہ سے مجھے مار ملیڈ نہ

کھانا چاہیے۔“

”نہیں بیٹے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہیں تو میری ہلت کا برا نہ مان جائے۔“

اس روز کلچ سے چھٹی تھی۔ سلیمان نے کتاب اٹھائی تو اماں نے اسے پڑھنے سے منع کر دیا۔ وہ لیٹے لیٹے تھک گیا پر دن تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اور کچھ نہیں تو تجھے کو آواز دے کر چاء کے لئے ہی کہہ دے لیکن اماں کے خیال سے رک جاتا۔ کچھ گنگنا چاہتا تو نہ جانے کیوں آواز حلق میں اٹک جاتی۔ پھر وہ چپ چاپ طوطے کو دیکھنے میں لگ جاتا لیکن اس روز طوطا بھی یوں بیٹھا تھا جیسے طنزاً اس پر ہنس رہا ہو۔ آخر اکتا کر اس نے کتاب اٹھا ہی لی۔ نہ جانے کون سی کتاب تھی وہ اور اس میں تصویریں دیکھتے دیکھتے پڑھنے لگا۔

”بیٹے سلیمان!“ اماں کی لجاجت بھری آواز سنائی دی۔

”اف۔۔۔۔۔!“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

اماں گھبرا گئی۔ ”نہیں نہیں بیٹے تو آپ سمجھدار ہے۔ جو تیرا جی چاہے کر میری تو ویسے ہی بری عادت ہے کہ تجھ سے تیرے بھلے کی کہتی رہتی ہوں۔ جو جی چاہے کر، اللہ رکھے آپ سمجھدار ہے۔“

”کیا کروں اماں۔ میں تو لیٹے لیٹے تھک گیا۔“ اس نے طبیعت کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں جو تیری خوشی ہو کر۔“ اماں بولی۔

”میری خوشی“ وہ ہنسا۔ ”اماں میری خوشی تو رہی ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے ہے ہی نہیں۔ ویسے میرا جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔“ اور وہ چپ ہو گیا۔

”کیا جی چاہتا ہے بیٹے؟“ اماں نے پوچھا۔

”بتاؤں؟“ وہ مذاقاً کہنے لگا۔ ”جی چاہتا ہے اپنے کمرے میں چلا جاؤں۔“

”اپنے کمرے میں؟“ اماں نے حیرانی سے دہرایا۔ ”یہی تو ہے تیرا

کمرہ۔۔۔۔۔!“

”ہے تو یہی۔۔۔۔۔“ لیکن رہا نہیں“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”دیکھو اماں میں دکھاؤں اپنا کمرہ تمہیں؟“

اس نے الماری میں سے سب کتابیں نکال کر انہیں ڈھیریوں میں ادھر ادھر بکھیر دیا۔ دو ایک کرسیاں الٹ پلٹ کر دس گدیاں ایک طرف پھینک دیں اور پھر بوٹ سمیت صوفے پر گر کر ہنسنے لگا۔ ”دیکھا اماں یہ ہے میرا کمرہ!“

اس کی ہنسی میں دیوانگی کی جھلک محسوس کر کے اماں نے چیخ سی ماری۔ ”سلیمان۔۔۔۔۔“ کیا ہے تمہیں بیٹا۔ ذرا تیرا سر دیکھوں۔“ اس نے سلیمان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں جانوں بخار دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ ہائے اللہ ماری یہ چائے کی خشکی۔ کیوں بیٹے۔ کیسی ہے طبیعت؟“ وہ بولی۔

طوطے نے یوں چیخ ماری جیسے وہ سلیمان پر ہنس رہا ہو۔ سلیمان نے محسوس کیا جیسے طوطا اسے طعنہ دے رہا ہو۔ وہ اماں سے کہنے لگا۔ ”میرا جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔“ اس طوطے کو اڑا دوں“ ہنستے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور لپک کر پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ طوطے نے پر پھڑپھڑائے اور بیٹھا رہا۔

”شی شی۔۔۔۔۔“ شی۔“ سلیمان نے تالی بجا کر اُسے اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اے ہے سلیمان، کیا ہے تجھے۔“ اماں لجاجت سے بولی۔ ”ایسے پیارے پالتو کو اڑاتے ہوئے دکھ نہیں ہوتا تمہیں؟ ہائے ہائے کیسا پیارا۔۔۔۔۔۔“

”پیارا پالتو۔۔۔۔۔“ وہ کھلکھلا کر دیوانہ وار ہنسا۔۔۔۔۔۔ ”پیارا پالتو۔۔۔۔۔۔“

”سلیمان۔۔۔۔۔!“ اماں نے دُر سے چیخ ماری۔ ”میرے اللہ کیا ہے میرے بیٹے کو؟“

”پیارا پالتو!“ وہ از سر نو جوش سے ہنسنے لگا۔۔۔۔۔۔ ”پیارا پالتو۔۔۔۔۔۔!!“